جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک اور مغائرت کے عناصر:
تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم فل (اُردو)

مقالہ نگار:

حبیب الرحمٰن

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فروری، ۲۰۲۱ء

جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک اور مغائرت کے عناصر:
تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار:

حبیب الرحمٰن

یہ مقالہ

ایم فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فروری، ۲۰۲۱ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک اور مغائرت کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: حبیب الرحمٰن رجسٹریشن نمبر: F18-21766

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر عابد حسین سیال _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

پرو ریکٹر

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں، حبیب الرحمٰن حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم فل اُردو اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عابد حسین سیال کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

_____

حبیب الرحمٰن

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

مقالہ اور دفاع کی منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	ix
اظہارِ تشکر	xi

باب اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث

ا۔	تمہید	01
i.	موضوع کا تعارف	01
ii.	بیان مسئلہ	01
iii.	مقاصدِ تحقیق	01
iv.	تحقیقی سوالات	02
v.	نظری دائرہ کار	02
vi.	تحقیقی طریقہ کار	03
vii.	مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	03
viii.	تحدید	04
ix.	پس منظری مطالعہ	04
x.	تحقیق کی اہمیت	06
ب۔	شاعری اور تشکیک	06
i.	تشکیک کے عناصر	06
ii.	شاعری اور تشکیک کے عناصر	06
ج۔	شاعری اور مغائرت	07

i. مغائرت کے عناصر 07
ii. شاعری اور مغائرت کے عناصر 08
د۔ جون ایلیا کا تعارف 09
i. حالاتِ زندگی 09
ii. تصانیف 13
حوالہ جات
باب دوم: جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک اور مغائرت کے محرکات 17
ا۔ خاندانی محرکات
i. والد کا عالمانہ استغراق 17
ii. والدہ کی محرومیاں 19
iii. ایک دیرینہ وعدے کی عدم تکمیل 20
iv. پراسرار ماحول 21
ب۔ سیاسی و سماجی محرکات 21
i. ہجرت 21
ii. سیاسی اور سماجی انتشار 23
ج۔ خانگی محرکات 24
i. ناکام ازدواجی زندگی 24
ii. اولاد سے علاحدگی 25
د۔ مثالیہ پسندی 25
حوالہ جات
باب سوم: جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک: تجزیاتی مطالعہ 32
ا۔ تشکیک کا مفہوم و روایت 32
i. تشکیک کی صوفیانہ روایت 33

ii. تشکیک کی فلسفیانہ روایت 35
iii. تشکیک کی شاعرانہ روایت 36
ب۔ جون ایلیا کے تعقل کا سفر 40
i. یقین 41
ii. تشکیک 44
iii. لاادریت 46
iv. الحاد 48
v. انکار 50
ج۔ جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک کی صورتیں 52
i. وجودِ خدا پر تشکیک 52
ii. انسانی تعلقات پر تشکیک 56
حوالہ جات
باب۔ چہارم: جون ایلیا کی شاعری میں مغائرت: تجزیاتی مطالعہ 66
ا۔ مغائرت کا مفہوم 67
i. مغائرت کی وجوہات 68
ii. انسانی زندگی پر مغائرت کے اثرات 69
ب: اردو شاعری میں مغائرت کی مثالیں 70
ج۔ جون ایلیا کی شاعری میں مغائرت کی صورتیں 74
i. لایعنیت 78
ii. خود تضحیکی 80
iii. خود انہدامی 83
حوالہ جات
باب پنجم: ماحصل 92

ا۔ مجموعی جائزہ 93
ب۔ تحقیقی نتائج 99
ج۔ سفارشات 101
کتابیات

Abstract

Jaun Elia is a very popular poet band. His popularity is reaching new heights with each passing day. Past some years have seen reasonable research projects on him but these researches focus mainly on his poetic genius and not the philosophical side of him that is represented in his poetry. None of them talk about the thought process or the deeper meanings that his very famous couplets carry. His poetry characterises of skepticism that leads to his alienation. The study here tries to find the reasons behind his skeptic and alienated nature and what effects does it have on his poetry. Skepticism, Nihilism, anarchism and alienation were popularised in postmodernism. Jaun Elia started his poetic career in mid-twentieth century. The era was marked by postmodern and deconstructionist ideologies that affected Jaun Elia as well. Therefore it is important to place his poetry in the context of the era it was written in The researcher has chosen a couple of the concepts from postmodernism to analyze Jaun Elia's Poetry. His poetry reflects the fragmentation of the postmodern world that he was a part of. His sensitivity could not let him go beyond himself and whatever he could take out of him was via poetry. Thus he created such masterpieces that would be remembered by the generations to come.

اظہارِ تشکر

ویلے کے ثمرات اور کویلے کے صدمات پر جامعات کے صدر دروازوں سے ٹرکوں کے ماتھے تک سجے ہوئے ہیں۔ آذانیں اور نمازیں ہوں یا راگ اور راگنیاں، اپنے اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہیں۔ گود سے گور تک علم کی فرضیت کا یہ مطلب نہیں کہ گور میں پاؤں لٹکائے اپنا لاشہ گھسیٹتے جامعات کے کلاس رومز میں جا بیٹھیں۔ رسمی تعلیم عمر کے مقررہ دورانیے میں ہی اچھی لگتی ہے۔

میرے ایک سابقہ رفیق کار ڈاکٹر ارشد معراج نے مجھے بہت پہلے ایم فل کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن میری طبعی سستی اور سفر کی صعوبت کا خوف حائل رہا۔ میرے دیرینہ ہم سفر رانا محمود الحسن کے بارے میں ایک دن اچانک پتا چلا کہ وہ ڈاکٹر رانا محمود الحسن کی حیثیت سے نمل کے شعبہ اردو کا حصہ بن چکے ہیں تو اپنے ننگ قافلہ ہونے کے احساس نے جھرجھری لی۔ لیکن جب شہر میں ڈاکٹر محمد نجیب ساٹھ سال کی عمر میں اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد بی اے، ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تکمیل کا جشن منایا تو میری غیرت انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار ڈاکٹر عابد سیال سے کیا تو انہوں نے ہاتھ تھام لیا۔ یہ دستِ مسیحا مجھے اظہار تشکر تک لے آیا ہے۔

نمل میں داخلہ میرے لیے کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ اس کے لیے میں سابق صدر شعبہ ڈاکٹر روبینہ شہناز اور داخلہ کمیٹی کے جملہ معزز ممبران کا شکر گزار ہوں۔ نمل کے اساتذہ ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر رانا محمود الحسن، ڈاکٹر عابد حسین سیال، ڈاکٹر روبینہ، ڈاکٹر دلشاد بیگم، ڈاکٹر رخشندے مراد، ڈاکٹر صائمہ نذیر خصوصی شکریے کی مستحق ہیں۔

گھر سے نمل آنے جانے کا تکلیف دہ مرحلہ حسن ظہیر راجہ نے حل کر دیا۔ شکریے کا لفظ شاعرانہ ہم سفری کی لطافتوں کا احاطہ نہیں کر رہا۔ نمل میں شعبہ اردو کے جواں سال استاد اور افسانہ نگار عثمان غنی رعد، فرہاد احمد فگار اور آفاق خالد کی رفاقت اور معاونت کا بہت شکریہ!

کلاس کے سی آر ارشد محمود ہادی کے اخلاص اور معاملہ فہمی کے باعث کلاس کا ماحول پر سکون رہا اور بر وقت راہنمائی ملتی رہی۔ اس دوران ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سائے روشنی نگلتے ہیں'' شائع ہوا۔ ان کی راہنمائی اور تعاون کا شکریہ اور کتاب کی آمد پر مبارک باد۔ دل یہ چاہتا ہے کہ کمرہ نمبر 21 میں بیٹھے 20 کلاس فیلوز پر علاحدہ علاحدہ کلام کروں لیکن اظہارِ تشکر کے لیے جگہ کی تنگی حائل ہے۔ ان تمام مہربانوں اور محسنوں کا فرداً فرداً شکریہ!

یہ مقالہ لکھنے کا مرحلہ آیا تو دنیا کو کرونا نے آلیا۔ ایسے میں جب تمام کتب خانے بند تھے، اگر ریختہ ڈاٹ کام کی سائبر لائبریری نہ ہوتی تو یہ کام مشکل سے مکمل ہوتا۔ جناب سنجیف سراف اور ان کی ٹیم کا بہت شکریہ۔ اگر نٹ کی سہولت نہ ہوتی تو یہ مقالہ بر وقت پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے لیے نٹ پوائنٹ کہوٹہ کے سید شعیب شاہ اور وحید قریشی صاحب کا بہت شکریہ کہ انہوں نے سروس کی ترسیل کو ممکن بنائے رکھا۔

کتب کی اہمیت اپنی جگہ لیکن گرہ کشائی اور مسیحائی کے لیے بہر حال آدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صد شکر کہ شہر میں ایک زندہ شخصیت جاوید احمد کی صورت میں موجود ہے۔ جو قمر جمیل صاحب کے صحبت نشین، جشن جون ایلیا دبئی کے شریک ہیں۔ ان کی علم دوستی نے مجھ ایسے بہت سوں کو مقالہ نگار بنا دیا ہے۔ جواں سال شاعر اور نقاد عبد اللہ ابراہیم کمال کے اس کمال کا شکریہ کہ انہوں نے فلسفے پر کتب فراہم کر دیں۔ میڈم تنزیلہ محمود کے بے لوث تعاون کا دلی شکریہ کہ انہوں نے مابعد جدید تھیوری کے متعلق بیش قیمت مواد فراہم کیا۔ کورس ورک اور مقالہ تحریر کرتے ہوئے گھر کے معاملات سے کنارہ کش ہو گیا۔ اس کے لیے اپنی شریک حیات غزالہ حبیب اور بیٹیوں ردا اور فضہ اور برادر نسبتی واجد علی تنولی کا خصوصی شکریہ!

انتساب کی روایت ختم کر دی گئی وگرنہ اس مقالے کا انتساب صدر شعبہ اردو جامعہ نمل ڈاکٹر عابد سیال کے نام ہوتا۔ خوشی کی بات ہے کہ ان کی شبانہ روز محنت سے جامعہ نمل کے شعبہ اردو کی نئی نمود ہو رہی ہے۔ اس مقالے میں کوئی تناسب ہے تو انہی کے رہین منت ہے۔

حبیب الرحمن

باب اول

تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

i۔ موضوع کا تعارف:

جون ایلیا (14 دسمبر، 1931ء– 8 نومبر، 2002ء) اکیسویں صدی کے ایک معتبر اردو شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اپنی وفات کے کچھ عرصہ بعد سے وہ سوشل میڈیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی وائرل شاعری عمومی نوعیت کی ہے۔ ضرورت محسوس کی گئی کہ ان کے کلام کی بہتر تفہیم کے لیے ان کی فکر کے اساسی پہلوؤں پر مابعد جدید تناظر میں کام کیا جائے۔ اسی لیے تحقیق کے لیے فلسفیانہ جہت سے ان کے کلام میں تشکیک اور مغائرت کے عناصر کے تجزیاتی مطالعہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ پچھلے دو تین سالوں میں ان کی نثر اور شاعری پر تحقیقی کام منظرِ عام پر آیا ہے لیکن اب تک مذکورہ جہت سے کوئی کام نہیں ہوا۔

ii۔ بیان مسئلہ

جون ایلیا کی شاعری کا سفر بیسویں صدی کے نصف میں شروع ہوا۔ یہ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور ڈی کنسٹرکشن کا دور تھا۔ اس لیے ضرورت محسوس کی گئی کہ ان کی شاعری کا روایتی تناظر کی بجائے مذکورہ تناظر میں جائزہ لیا جائے۔

iii۔ تحقیق کے مقاصد

- جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا۔
- جون ایلیا کی شاعری میں مغائرت کے عناصر کا جائزہ لینا۔
- جون ایلیا کی شاعری میں مجوزہ عناصر کی وجوہات کا تعین کرنا۔

iv۔ تحقیقی سوالات

- جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک اور مغائرت کے عناصر کی کار فرمائی کس نوع اور کس درجہ

کی ہے؟

- جون ایلیا کی شاعری میں مجوزہ عناصر کے اظہار کے محرکات اور اثرات کیا ہیں؟

v۔ نظری دائرہ کار

پوسٹ ماڈرن ازم ایک پیچیدہ نظریہ ہے۔ اس کے خد و خال ابھی تک پوری طرح واضح نہیں ہوئے۔ لیکن یہ نظریہ جن اجزا سے مرکب ہے وہ عناصر جون ایلیا کی شاعری میں موجود ہیں۔ جن میں نفی پسندی، بیزاری، بغاوت، طنز، تشکیک، تنہائی، بیگانگی شامل ہیں۔ اس لیے محقق نے جون ایلیا کی شاعری کے تجزیے کے لیے اس کا انتخاب کیا ہے۔ مابعد نظریہ سازوں کے مطابق تاریخ طاقتور طبقوں نے اپنی مرضی سے لکھوائی ہے۔ علم کا سرچشمہ بھی طاقت ہی رہی ہے۔ مغرب نے موجودہ علم کی بنیاد اپنی ترجیحات کے مطابق رکھی ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ علم معروضی نہیں موضوعی ہوتا ہے۔ سچائی اور علم مقامی ہوتے ہیں کوئی حتمی اور آفاقی سچائی نہیں ہے۔ حقیقت محض وہ تصور ہے جس نے شعور کی اس ساخت میں جنم لیا تھا جو حقیقی نہ ہونے کی وجہ سے فنا ہو چکی ہے۔ اس لیے کسی بھی چیز کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اس سلسلے میں پہلا نام مشل فوکو کا ہے۔ جس نے اپسٹیم، طاقت اور ڈسکورس کی اصطلاحات متعارف کرائیں۔ ہر عہد کی اپنی اپسٹیم ہوتی ہے۔ ایک عہد کی اپسٹیم دوسرے عہد کے لیے حوالہ تو بن سکتی ہے لیکن حجت نہیں ہو سکتی۔ مشل فوکو جرم، جسم، جنس اور پاگل پن کی بات کرتا ہے۔ اس کے بقول مغرب کا موجودہ ڈسکورس پاگل پن ہے۔ لیکن اگر پاور اور ڈسکورس بہم ہو جائیں تو تبدیلی آسکتی ہے۔

نٹشے نے کہا تھا انسان کا وجودی نقص مرمت کی بجائے انہدام کا تقاضا کرتا ہے۔ نفیء محض کا یہی نظریہ پوسٹ ماڈرن ازم کی بنیاد ٹھہرتا ہے۔ جین فرینکوس لیوتار (Jean-Francois Lyotard) کے مطابق علم تجربہ، تجزیہ، دلیل اور حقائق سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اس لیے کوئی قدیم علم آفاقی سچائی کا حامل ہے، نہ مغرب کا جدید علم، کیونکہ اس کی تشکیل طاقت سے کی گئی ہے۔ مہابیانیوں نے جبر اور مطلق العنانیت کو جنم دیا ہے۔ سچائیاں چھوٹی، وقتی اور مقامی ہوتی ہیں۔ یاک دریدا کی آف گریمیٹالوجی کے مطابق ہم کسی متن کے

ساتھ ایک تعلق سا قائم کر لیتے ہیں۔ اور کچھ معانی منسوب کر لیتے ہیں۔ انسانی شعور میں کسی مستقل ادارک پر رہنے کی صلاحیت یا میلان نہیں پایا جاتا۔

پوسٹ ماڈرن ازم مکمل انارکی ہے۔ اور یہی چیز ہمیں جون ایلیا کے ہاں ملتی ہے۔ تشکیکی فلاسفہ ہر چیز کو، چاہے وہ مابعد الطبیعاتی ہو یا سماجی، شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جون ایلیا کے ہاں بھی تشکیکی رویہ غالب ہے۔ اس لیے تشکیک کے ساتھ ساتھ مغائرت کا عنصر بھی مابعد جدید رجحان کا نمائندہ ہے۔ تشکیک مزاج بن جائے تو انسان خود کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ مغائرت کا ایک بڑا سبب ٹیکنالوجی ہے۔ جس نے انسان کو انسان سے ہی دور نہیں کیا بلکہ خود سے بھی بیگانہ کر دیا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار

مجوزہ موضوع سے متعلق مطبوعات کی جمع آوری، ترتیب اور مطالعہ و تجزیہ کیا گیا۔ اس میں تجزیاتی اور تنقیدی طریقِ کار استعمال کیا گیا۔ چونکہ تحقیق فلسفیانہ حوالوں سے کی جا رہی ہے اس لیے جون کی غزل کے ساتھ ان کی نظمیں بھی مقالہ لکھتے ہوئے پیشِ نظر رہیں۔ بنیادی مآخذات میں جون ایلیا کے شعری مجموعے اور ثانوی مآخذات میں کتب اور مضامین سے استفادہ کیا گیا۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

جون ایلیا کی شاعری پر اب تک یہ تحقیقی کام ہو چکا ہے:

- سید محمد عاصم نقوی، جون ایلیا: شخص و شاعر، مقالہ برائے ایم اے، جامعہ کراچی، 1981ء
- شازیہ صدیقی، جون ایلیا: شخصیت و شاعری کا مطالعہ، مقالہ برائے ایم اے، جامعہ کراچی، 2004ء
- عادل بادشاہ، جون ایلیا کی غزل گوئی، مقالہ برائے ایم فل، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، 2018ء

- نیہا اقبال، جون ایلیا، حیات اور شاعری، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، بھارت، 2018ء
- محمد مبشر متین، جون ایلیا کی شاعری کا عروضی مطالعہ، ایم فل، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور، 2019ء
- امتیاز احمد، اردو ادب کے منتخب شعرا کی تخلیقی نثر، (منیر نیازی، جون ایلیا، سرمد صہبائی)، بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان، 2019ء

گزشتہ کچھ سالوں میں جون ایلیا پر قابلِ قدر کام سامنے آیا ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں تشکیک اور مغائرت کے عناصر کو پہلی مرتبہ تحقیق کی اساس بنایا گیا ہے۔

viii۔ تحدید

یہ تحقیق جون ایلیا کی شاعری کے تجزیے پر مشتمل رہی۔ اس میں ان کے شعری مجموعے: شاید، یعنی ، گمان، لیکن اور گویا کی متعلقہ غزلیں اور نظموں کے حصے شامل تھے۔ دیگر کتب اور کلام اس میں شامل نہیں۔ اسی طرح جون کی شاعری کی فکری جہات بھی متنوع ہیں جن میں سے صرف تشکیک اور مغائرت زیر نظر رہیں۔

ix۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعے کے طور پر سب سے پہلے امروہہ کی تاریخ و تہذیب کی تفہیم کے لیے محمود احمد عباسی کی کتاب ''تاریخِ امروہہ'' کا مطالعہ کیا گیا۔ امروہہ کے ادبی ماحول کی تفہیم کے لیے عظیم امروہوی کی کتاب ''قصیدہ نگاران امروہہ''، رفیع رفعت انصاری امروہوی کی کتاب ''نامورانِ امروہہ''، مصباح احمد صدیقی کی کتاب ''تذکرۂ علمائے امروہہ ''اور مصباح احمد صدیقی کی کتاب ''شعرائے امروہہ''کا مطالعہ کیا گیا۔ تشکیک اور مغائرت اور ان سے متعلقہ مختلف اصطلاحات کو سمجھنے کے لیے جن لغات اور کتب سے استفادہ کیا گیا ان میں مولوی سید تصدق حسین رضوی کی مرتب کردہ ''لغتِ کشوری''، سید احمد دہلوی

کی ''فرہنگ آصفیہ''، پروفیسر شیخ منہاج الدین کی ''قاموس الاصطلاحات''، سلیم شہزاد کی مرتبہ ''فرہنگ ادبیات''، ''فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ''، جلد دوم، مرتبہ جمیل جالبی، کلیم الدین احمد کی مرتبہ ''فرہنگ ادبی اصطلاحات''، ظہیر رحمتی کی ''غزل کی تنقید کی اصطلاحات'' اور عتیق اللہ کی ''ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آن لائن انسائیکلو پیڈیاز سے بھی استفادہ کیا گیا۔ مغائرت کی تفہیم کے لیے محمد صفدر میر کی ''مارکس کا نظریۂ بیگانگی''، کارل مارکس کی ''داس کیپٹل''، مترجمہ سید محمد تقی، جین پال سارتر کی '' ایگزسٹنشلزم از ہیومنزم'' اور افتخار بیگ کی کتاب ''وجودیت اثباتِ ذات کا فلسفہ'' کا مطالعہ کیا گیا۔ جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک اور مغائرت کے تشکیلی مراحل کی تفہیم کے لیے ان کی شخصیت کے تشکیلی عناصر پیشِ نظر رہے۔ اس کے لیے جون ایلیا کے شعری مجموعوں شاید، یعنی، گمان، لیکن اور گویا کے ساتھ ساتھ جون ایلیا کی شخصیت اور فکر کی تفہیم کے لیے نسیم سید کے مرتب کردہ مضامین کے مجموعہ ''خوش گزراں گزر گئے'' کا مطالعہ کیا گیا۔ مشمولہ مضامین میں اکثر جون ایلیا کے بہت ہی قریبی جاننے والوں کے ہیں۔ انور احسن صدیقی کی خود نوشت ''دل پر خوں کی اک گلابی سے'' کے بعض واقعات جون ایلیا کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوئے۔ جون ایلیا پر لکھی گئی ان کی بھتیجی شاہانہ رئیس ایلیا کی کتاب ''چچا جون'' گھر کی گواہی کے حوالے سے شہرت رکھتی ہے۔ اس کا مطالعہ جون ایلیا کے شخصی بگاڑ کی تفہیم میں بہت معاون ثابت ہوا۔ مقالہ نگاری کے دوران خالد احمد انصاری کی مرتب کردہ جون ایلیا کے بارے میں چھپنے والے مضامین اور انٹرویوز کا مجموعہ ''میں یا میں'' منظر عام پر آیا۔ اس مقالے کی تکمیل میں یہ مجموعہ بہت معاون ثابت ہوا۔ جون ایلیا پر لکھے جانے والے تحقیقی مقالوں تک رسائی حاصل کی گئی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ استفادہ ڈاکٹر نیہا اقبال کے پی ایچ ڈی کے مقالے ''جون ایلیا – حیات اور شاعری'' سے کیا گیا۔ مختلف اخبارات اور رسائل میں ان پر چھپنے والے مضامین کا مطالعہ کیا گیا۔ ان مضامین اور کالموں کے علاوہ یوٹیوب پر مذاکروں اور آرا کی وڈیوز بھی پیش نظر رہیں۔

x۔ تحقیق کی اہمیت

جون ایلیا عوامی سطح پر مقبول ترین شاعر ہیں۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اُن کے شعری مجموعوں اور پھر ان مجموعوں کی اضافہ شدہ ایڈیشنوں کی اشاعت سے لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن شخصی تضادات نے انہیں عجوبہ بنادیا ہے۔ دراز زلفیں، زنانہ کپڑے، رات کو دھوپ کا چشمہ لگانا، گرمیوں میں کمبل اوڑھنا، کھڑاؤں پہننا، کبھی جہاز کے کیپٹن کا لباس پہن لینا وغیرہ ان کے لئے عام بات تھی۔ اس کے علاوہ مشاعروں میں کلام کی نرالی پیش کش نے بھی انہیں متنازعہ بنادیا ہے۔ کلام سناتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونا، مختلف ڈائیلاگ بولنا، بعض حاضرین کو نام لے کر مخاطب کرنا اور کچھ کو بلا کر سٹیج پر اپنے ساتھ بٹھالینا وغیرہ۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا سب کچھ وہ توجہ حاصل کرنے کے لیے کرتے تھے۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ فطرتاً ہی ایسے تھے۔ اس لیے انہیں ٹوٹ کر چاہنے اور ان سے انتہائی نفرت کرنے والوں کی کثرت ہے۔ ان کے ارادت مند انہیں اولیا، سرکار، مرشد تک کہتے ہیں۔ جب کہ مخالف ملحد، مرتد، یہودی وغیرہ ایسے نفرت انگیز ناموں سے مخاطب کرتے ہیں۔ اس سب کے باوجود وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شہرت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات و واقعات میں ان کی شاعری اپنی جگہ بناتی چلی جارہی ہے۔ بعض یونیورسٹیوں نے اپنے ایم اے کے نصاب میں ان کے کلام کو جگہ دی ہے۔ ان پر تحقیقی کام بھی ہو رہا ہے۔ لیکن زیادہ تر کام ان کے فن پر ہے۔ فکر پر کم کام ہوا ہے۔ مابعد جدید تناظر میں یہ تحقیقی مقالہ جون شناسی میں معاون ہو گا۔

ب) شاعری اور تشکیک:

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ شاعری اور تشکیک کا چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن یہ سنگت اتنی کمزور بھی نہیں ہے۔ اعلیٰ ترین حقیقت کا ادراک جس سماجی اقلیت کا مسئلہ ہے اس میں فلسفیوں اور صوفیوں کے ساتھ ساتھ بڑے شاعر بھی شامل ہیں۔ جامد معاشرے میں تشکیکی کرب کا اظہار نثر میں مشکل ہے۔ جب کہ شاعری میں نو بہ نو طریقوں سے سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں۔ پھر شاعر کے پاس کتھارسس کا واحد ذریعہ الفاظ کے صورت میں اظہار ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ

"For every man who thinks and lives by thought
must have his own scepticism, that which stops at

the question, that which ends in denial, or that which leads to faith and which is somehow integrated into the faith which transcends it. "(1)

i. تشکیک کے عناصر

چیزوں کے بارے میں رائے قائم کرنے میں پس و پیش سے کام لینا تشکیک کہلاتا ہے۔ "تشکیک یا تشکک کی اصطلاح تیقن کے متضاد استعمال ہوتی ہے۔ اس مکتب فکر کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ ہم کسی مسئلے پر کوئی حتمی اور قطعی رائے نہیں دے سکتے کیوں کہ ایک امر دوسرے کی نفی کر دیتا ہے۔" (2) گویا متشکک آزادانہ سوچ کے قائل ہوتے ہیں۔ چیزوں پر سوال اٹھاتے ہیں اور تضادات کو واضح کرتے ہیں۔ یہ یقین سے متصادم رویہ ہے اور کسی مہابیانیے تک کی تصدیق میں پس و پیش سے کام لیتا ہے۔

ii. شاعری اور تشکیک کے عناصر

کسی شاعر کا اپنے تشکیکی رویے کا اظہار شاعری میں کرنا۔ شاعری یقین اور تشکیک دونوں کی بنیاد پر قائم ہو سکتی ہے۔

ج) شاعری اور مغائرت:

شاعری اور مغائرت کا گہرا تعلق ہے۔ تخلیق کار اطراف بلکہ اپنی ذات سے بھی کٹ کر رہ جاتا ہے۔ سماجی بے دخلی کا یہ عمل شاعر کے دل و دماغ کو بری طرح متاثر کرتا ہے اور سماجی برگشتگی اور بغاوت کا باعث بنتا ہے۔ محمد اکرم سرا اپنے مضمون تصورِ بیگانگی اور ادب میں کہتے ہیں

"بیگانگی کی اصطلاح بہت سے علوم و فنون میں مستعمل ہے۔ اسے انسان کی ذاتی نفسیاتی حالت سے لے کر سماجی تعلقات کار تک میں استعمال کیا جاتا ہے۔۔۔ ادب میں ایک فرد کی نفسیاتی بے دخلی کو ہی زیادہ تر موضوع بنایا گیا ہے۔ جس کی بہترین مثال شیکسپیر کا کردار ہیملٹ کہا جا سکتا ہے۔ تنقیدی سماجی نظریئے میں بیگانگی ایک فرد کی خود سے جدا ہونے کی اضافی صورتِ حال ہے۔" (3)

i. مغائرت کے عناصر

مارکس کے نزدیک بیگانگی کے بنیادی عناصر محنت کش، پیداوار اور سرمایہ دارانہ استحصال ہے۔ سرمایہ داری میں انسان کو شے بنادیا جاتا ہے۔ جس سے معاشرہ آجر اور اجیر میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ محنت کش کو اس کی پیداوار کا معمولی معاوضہ دے کر اس سے علاحدہ کر دیا جاتا ہے جو سماجی بیگانگی کا باعث بنتی ہے۔ (4) جب کہ وجودی تصورِ بیگانگی کا بنیادی عنصر اثباتِ ذات کی خواہش، اس خواہش کی عدم تکمیل اور اس کے نتیجے میں بیگانگی کا جان لیوا احساس ہے۔Stanford Encyclopedia of Philosophy کے مطابق Alienation کے تشکیلی عناصر تین ہیں۔ فاعل، مفعول اور ان کے درمیان تکلیف دہ علاحدگی۔

> "The characterisation of alienation offered here—as a social or psychological ill involving the problematic separation of a subject and object that properly belong together—involves three constituent elements: a subject, an object, and the relation between them." (5)

ii. شاعری اور مغائرت کے عناصر

کسی شاعر کا بیگانگی کے تکلیف دہ احساس سے گزرنا اور اس کا شعری اظہار کرنا۔

د) جون ایلیا کا تعارف:

i. حالاتِ زندگی

سید جون اصغر المعرف بہ جون ایلیا 14 دسمبر 1931ء کو محلہ دربار شاہ ولایت، امروہہ، اتر پردیش، بھارت میں پیدا ہوئے۔ امروہہ کا شمار ہندوستان کے قدیم شہروں میں ہوتا ہے۔ اس کی قدیم تاریخ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ویدک عہد سے آباد چلا آرہا ہے۔ لیکن اس کے ماضی کی کوئی مستند تاریخ میسر نہیں ہے۔

تاریخ امروہہ کے مصنف محمود احمد عباسی لکھتے ہیں کہ روایت کے مطابق امروہہ ہستناپور کے ایک راجا امر جودھ نے بسایا تھا۔ لفظ امروہہ، سنسکرت لفظ امروانم سے مشتق ہے۔[6] روایت ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے 1017ء میں امروہہ فتح کیا۔ لیکن ہندوؤں نے پھر اس پر قبضہ کر لیا۔ غازی سالار مسعود، شہاب الدین غوری اور قطب الدین ایبک نے ہندوؤں کی سرکوبی کی لیکن بغاوتیں جاری رہیں۔[7] تیرویں صدی میں غیاث الدین بلبن نے یہاں اتنے مسلمان بسائے کہ یہ مسجدوں، امام بارگاہوں، خانقاہوں اور مدارس کا شہر بن گیا۔[8] اسی دور میں سید شرف الدین نواح ملتان سے امروہہ آئے اور شاہ ولایت کے نام سے مشہور ہوئے۔[9] سلطان محمد تغلق کے دور میں مشہور سیاح اور مورخ ابن بطوطہ 1340ء میں یہاں آیا۔ وہ اس خانقاہ کے شیخ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے

> امروہہ ایک خوبصورت مگر چھوٹا قصبہ ہے۔ اس کے عمال قاضی امیر علی اور شیخ زاویہ (یعنی شاہ ولایت کی خانقاہ کے شیخ) میرے استقبال کو آئے اور ان دونوں نے مل کر میری اچھی دعوت کی۔[10]

ابنِ بطوطہ نے جس امروہہ کو خوبصورت اور چھوٹا پایا تھا۔ وہ بعد میں صاحب قصیدہ نگارانِ امروہہ کے بقول "اولیا کا مسکن، علما کا معدن، شعرا کا مخزن، اطبا کا گڑھ اور تہذیب کا گہوارہ بنا۔[11]

شاید کے دیباچے میں جون ایلیا نے امروہہ کو "حالت خیز، رمزیت آمیز اور دل انگیز شہر" لکھا ہے۔[12] رفیع رفعت انصاری نے "نامورانِ امروہہ" میں امراہہ کی تین سو پچپن (355) شخصیات کو منظوم خراج پیش کیا ہے۔[13] مصباح احمد صدیقی نے اپنی کتاب تذکرۂ علمائے امروہہ میں ایک سو بتیس (132) امروہوی علما کا ذکر کیا ہے۔[14] شاعری کا تو یہ مرکز رہا ہے۔ اسی مرکزیت کے باعث اسے ایوانِ شاعری کہا گیا ہے۔ غلام ہمدانی مصحفی سے ڈاکٹر خورشید رضوی تک امروہوی شعرا کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ مصباح احمد صدیقی نے "شعرائے امروہہ" میں تین سو سولہ (316) امروہوی شعرا کا ذکر کیا ہے۔[15] عظیم امروہوی نے صرف امروہوی قصیدہ نگاروں کی تعداد ایک سو چون (154) لکھی ہے۔(16) جن میں سے

ایک شفیق حسن ایلیاہیں۔ ان کی قادرالکلامی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے علامہ اقبال کے ایک مصرع ع کبھی اے حقیقت منتظر نظر آلباسِ مجاز میں پر طبع آزمائی کی تو صرف سولہ مطلع کہہ دیے۔ ایک ملاحظہ ہو:

کبھی وہ حقیقتِ لم یزل ہو عیاں جو شانِ مجاز میں

ملے ایک سجدے کا بھی نشاں نہ مری جبینِ نیاز میں (17)

شفیق حسن ایلیا قصیدہ کے ساتھ ساتھ نعت، منقبت، مرثیہ اور غزل کے شاعر بھی تھے۔ ان کی ایک غزل کا شعر دیکھیے

غیر تو غیر ہیں سب اپنے ہیں

کوئی اپنا نہیں سب اپنے ہیں (18)

یوں شاعری جون ایلیا کو ورثے میں ملی۔ شاید کا دیباچہ بتاتا ہے کہ ان کے والد شاعری کے ساتھ ساتھ بہت سے علوم کے جامع تھے۔ اور کافی زبانیں جانتے تھے۔ (19) ان کے گھر میں فنونِ لطیفہ، ادب، سیاست، مذہب، فلسفہ، نفسیات، ہیئت، مابعد الطبیعات اور علمِ نجوم زیر بحث رہتے تھے۔ بڑے بھائی رئیس امروہوی بھی شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹی عمر میں انہوں نے شاعری شروع کر دی۔ بقول جون ایلیا

"میری عمر کا آٹھواں سال میری زندگی کا سب سے زیادہ اہم اور ماجرا پرور سال تھا۔
اس سال میری زندگی کے دو سب سے اہم حادثے، پیش آئے۔ پہلا حادثہ یہ تھا کہ
میں اپنی نرگسی انا کی پہلی شکست سے دوچار ہوا، یعنی ایک قتالہ لڑکی کی محبت میں گرفتار
ہوا۔ دوسرا حادثہ یہ تھا کہ میں نے پہلا شعر کہا:

چاہ میں اس کی طمانچے کھائے ہیں

دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی" (20)

ڈاکٹر نیہا اقبال نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے، جون ایلیا حیات اور شاعری، میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ شاید کا دیباچہ لکھتے وقت جون ایلیا کی عمر 58 سال تھی، اس لیے وہ اصل عمر بھول گئے ہوں

گے اور انہیں خود کو عجوبہ بنا کر پیش کرنے کی عادت تھی تا کہ لوگوں میں مقبول رہیں۔[21] پروفیسر منظر عباس نقوی نے اپنے مضمون ''آہ جان ایلیا'' میں لکھا تھا کہ ''جون ایلیا لاکھ قسمیں کھائیں لیکن ہم اس آٹھ سال بچے کی محبت کے ناٹک یا کھیل سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ آٹھ سال تو ہوش سنبھالنے کی عمر بھی نہیں ہوتی۔'' [22]

ممکن ہے کہ جون ایلیا نے ماہ و سال کے اندراج میں مبالغے سے کام لیا ہو۔ لیکن غیر معمولی ہیجان اور والد کے عالمانہ استغراق سے بیزاری عین ممکن ہے کہ کسی ایسے تجربے میں ڈھل گئی ہو۔

جون ایلیا کا نام سید جون اصغر تھا۔ جو بعد میں جون ایلیا ہو گیا۔ ان کے تخلص کے حوالے سے ان کے قریبی عزیز سید محمد سیادت علی نقوی کہتے ہیں کہ

> ''پہلے جون عالی تخلص کرتے تھے۔ پھر انہوں نے عالی کو اصلی کو کر دیا۔ کافی عرصہ وہ اصلی ہی رہے۔ پاکستان جانے کے بعد بھائی جون نے اپنے آپ کو ایلیا قرار دے دیا۔ ایلیا حقیقتاً ان کے والدِ محترم شفیق حسن ایلیا کا دیا ہوا لفظ ہے۔ وہ خود کو ایلیا لکھتے تھے۔'' [23]

لیکن جون ایلیا کے پہلے مجموعہ کلام شاید میں آغازِ شاعری سے 1957ء سے پہلے کا جو کلام شامل کیا گیا ہے۔ اس میں تخلص جون ہی استعمال ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے جون نے ان اشعار کو شامل نہ کیا ہو جن میں عالی اور اصلی تخلص تھا، یا اسے جون سے بدل دیا ہو۔ پاکستان آنے کے بعد جون ایلیا کے ساتھ ساتھ ذہینہ ساہیکی، افروز آفشید اور آدم آفرو دیسی کے فرضی ناموں سے انشاء میں چھپتے رہے۔[24] انشا بند ہوا تو وہ عالمی ڈائجسٹ اور سسپنس ڈائجسٹ سے بطور مدیر وابستہ رہے۔ یہ پاکستان میں ڈائجسٹ کا آغاز تھا۔ یوں وہ پاکستان میں ڈائجسٹ کے بنیاد گزاروں میں شامل ہیں۔

جون ایلیا 1963ء سے 1968ء اسماعیلیہ ایسوسی ایشن، کراچی (اسماعیلہ طریقہ) کے شعبہء تحقیق و تصنیف میں جزوقتی سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اسلامی فلسفہ و تاریخ سے متعلق ترجمہ و تصنیف پر جو کام ہوا اس میں مسیحِ بغداد- حلاج، اسماعیلیت -شام و عراق میں، مطالعہ طواسین، اسماعیلیت - یمن میں،

تہذیب، رہائش وکُشایش، تجرید، مسائلِ تجرید، رسالہ حکمتی، عدد، کتاب الطواسین، قاطیغوریاس (CATEGORIES) اخبار الحلاج، بارامانیاس، جوہرِ صقلی، جومطریا، اسماعیلیت، جزیرہ عرب میں، ایساغوجی اور حسن بی صباح شامل ہیں۔ چونکہ اس کام کا جون ایلیا کو معاوضہ دیا گیا تھا اس لیے ان کتب میں سے بہت کم پبلک ہوئیں۔[25]

1966ء میں ترقیٔ اردو بورڈ کے زیرِ اہتمام جب اردو لغت پر کام شروع ہوا تو اس کے لیے جون ایلیا کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ جون ایلیا 1976ء تک اس کمیٹی کے رکن رہے۔ جہاں انہیں ڈاکٹر شوکت سبزواری، مولانا نسیم امروہوی اور شان الحق حقی ایسے اردو ادب کی جید شخصیات سے استفادے کا موقع ملا۔[26]

جون ایلیا تقسیم ہند کے مخالف تھے۔ لیکن پاکستان آنے کے بعد انہوں نے پاکستان کی تعمیر میں اپنا بساط بھر کردار ادا کیا۔ ان کے پاکستان آنے کے آٹھ سال بعد پاک بھارت جنگ چھڑ گئی۔ جون ایلیا نے قلم کے محاذ پر بھرپور شرکت کی اور چھ ملی نغمے لکھے جو تاج ملتانی، نگہت سیما اور احمد رشدی کی آواز میں پیش ہوئے۔[27] 16 دسمبر 1971ء سقوطِ مشرقی پاکستان پر پہلا منظوم ردِ عمل جون ایلیا کا پی ٹی وی کراچی سے منظرِ عام پر آیا۔[28] 1975ء میں امروہہ واپس گئے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد وہ پہلے پاکستانی تھے جنہیں ہندوستان کا ویزہ دیا گیا۔[29]

1970ء میں جون ایلیا کی شادی زاہدہ حنا سے ہوئی ۔ ان کے ہاں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔ لیکن اسی کی دہائی کے وسط میں دونوں میں طلاق ہو گئی۔ یہ علاحدگی ان کے لیے عذاب ناک ثابت ہوئی۔ کئی سال ایک نیم تاریک کمرے میں گوشہ نشینی میں گزرے۔ انہیں روشنی اور آوازوں سے ڈر لگتا تھا۔ سلیم جعفری انہیں اس تاریکی سے نکال کر دبئی اور امارات کی مشاعروں میں لے گئے۔[30] 1991ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام شاید منظر عام پر آیا۔ دبئی میں جشنِ جون ایلیا منایا گیا۔ تپِ دق، بے خوابی، بے آرامی، بے احتیاطی کے مریض تھے۔ مسلسل شراب نوشی سے پھیپھڑے جواب دے چکے تھے۔ طویل علالت کے بعد 8 نومبر 2002ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

ii. تصانیف

جون ایلیا کے اب تک پانچ شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:

۔ شاید : الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، سیکنڈ فلور، چوک پرانی انار کلی۔ لاہور، اشاعت اول 1991ء، اشاعت دوم 1992ء، اشاعت سوم1992ء، اشاعت چہارم 1992ء، اشاعت پنجم 1996ء، اشاعت ششم 1997ء، اشاعت ہفتم 1998ء، کل صفحات 321، اس میں کل 133 نظمیں، غزلیں، قطعات، مفردات شامل ہیں۔

۔ یعنی: الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، سیکنڈ فلور، چوک پرانی انار کلی۔ لاہور، اشاعت اول، جولائی 2003ء، اشاعت دوم اکتوبر 2003ء، کل صفحات 200، اس میں کل 79 نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔

۔ گمان: الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، سیکنڈ فلور، چوک پرانی انار کلی۔ لاہور، اشاعت اول، اکتوبر، 2004ء، اشاعت دوم مئی 2005، اشاعت سوم اگست 2006ء، کل صفحات 238، 10 نظمیں، 100 غزلیں اور 60 قطعات شامل ہیں۔

۔ لیکن: الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، سیکنڈ فلور، چوک پرانی انار کلی۔ لاہور، اشاعت اول، جنوری 2006ء، اشاعت دوم، جولائی 2006ء، کل صفحات 250، اشاعت سوم اگست 2006ء، کل صفحات 250، 16 نظمیں، 95 غزلیات اور قطعات شامل ہیں۔

۔ گویا : الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، سیکنڈ فلور، چوک پرانی انار کلی۔ لاہور، اشاعت اول، مئی 2008ء، کل صفحات 307، 20 نظمیں، 100 غزلیں اور 17 قطعات شامل ہیں۔

نثری تصانیف:

۔ فرنود: انشائیے اور مضامین، ترتیب و تالیف خالد احمد انصاری، الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، سیکنڈ فلور، چوک پرانی انار کلی۔ لاہور، اشاعت اول 2012ء

۔راموز: الواح، ترتیب و تالیف خالد احمد انصاری، الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، سیکنڈ فلور، چوک پرانی انارکلی۔ لاہور، اشاعت اول، مئی 2016ء

۔میں یا میں: مضامین، ترتیب و تالیف خالد احمد انصاری، الحمد، چوک پرانی انارکلی۔لاہور، 2019ء

حوالہ جات

1۔ David Gwilym James, Scepticism and Poetry : An Essay on the Poetic Imagination Barnes & Noble, 1960, P 27

2۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع ہشتم، 2020ء، ص 64

3۔ محمد اکرم سرا، تصورِ بیگانگی اور ادب، بازیافت – 30 (جنوری تا جون 2017)، شعبہء اردو، اورینٹل کالج، لاہور

4۔ محمد صفدر میر، مارکس کا نظریۂ بیگانگی، مکتبہ دانیال، کراچی، 1987ء، ص87

5۔ Skepticism, Stanford Encyclopedia of Philosophy, https://plato.stanford.edu/entries/alienation/, 23 July 2020, 11:24 pm

6۔ محمود احمد عباسی، تاریخِ امروہہ، کتاب دار، بمبئی، طبع اوّل، 2005ء، ص25

7۔ ایضاً، ص27

8۔ ایضاً، ص29

9۔ ایضاً، ص34

10۔ ایضاً، ص45

11۔ ایضاً، ص46

12۔ عظیم امروہوی، ڈاکٹر، قصیدہ نگاران امروہہ، عالمی مرثیہ سینٹر، نئی دہلی، 2016ء، ص14

13۔ شاید، جون ایلیا، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، طبع ہفتم، 1998ء، ص14

14۔ رفیع رفعت انصاری امروہوی، نامورانِ امروہہ، 2009ء، ص6

15۔ مصباح احمد صدیقی، تذکرۂ علمائے امروہہ، فرید ایجوکیشنل سوسائٹی، امروہہ، 2003ء، ص132

16۔ عظیم امروہوی، ڈاکٹر، قصیدہ نگاران امروہہ، ص13

17۔ مصباح احمد صدیقی، شعرائے امروہہ، رضا لائبریری، رام پور، بھارت، 2004ء، طبع اول، ص 232

18۔ ایضاً، ص233

19۔ جون ایلیا، شاید، ص17

20۔ جون ایلیا، شاید، ص17

21۔ نیہا اقبال، ڈاکٹر، جون ایلیا –حیات اور شاعری، ورثہ پبلی کیشنز، کراچی، 2019ء، ص76

22۔ منظر عباس نقوی، آہ جون ایلیا، (مضمون) مشمولہ: ایوان اردو، دہلی، 2003ء، جلد 16، شمارہ 10، ص31

23۔ سید محمد سیادت علی نقوی، جون ایلیا، یوٹیوب، ابوتراب نقوی، 25 دسمبر 2019ء، a.m11:12

24۔ سید محمد سیادت علی نقوی، جون ایلیا، یوٹیوب، ابوتراب نقوی، 25 دسمبر 2019ء، a.m11:12

25۔ جون ایلیا، شاید، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، طبع ہفتم، 1998ء، پس ورق

26۔ نیہا اقبال، ڈاکٹر، جون ایلیا –حیات اور شاعری، ورثہ پبلی کیشنز، کراچی، 2019ء، ص60

27۔ ابصار احمد، گیت بنے ہتھیار، ہلال، راولپنڈی، ستمبر 2015ء

28۔ افتخار عارف، بے پناہ شاعر، مشمولہ: میں یا میں، مولف، خالد احمد، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2019ء، ص111

29۔ نیہا اقبال، ڈاکٹر، جون ایلیا –حیات اور شاعری، ورثہ پبلی کیشنز، کراچی، 2019ء، ص60

30۔ جون ایلیا، شاید، ص12

باب دوم

جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک اور مغائرت کے محرکات

کسی کی شاعری کی بہتر تفہیم کے لیے اس شاعر کی شخصیت سے آشنائی ضروری ہے۔ کیوں کہ تخلیق اور تخلیق کار میں ایک وحدت ہوتی ہے۔ جون ایلیا منفرد شخصیت کے حامل تھے۔ جن نقادوں نے جون ایلیا کی شاعری پر گفتگو کی ہے ان میں احمد جاوید نمایاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جون ایلیا "سوچنے والے اعصاب لے کر آئے تھے"۔[1] اور ان کی شاعری کا "مادۂ معنویت اور جوہرِ کیفیت"[2] خود وہ تھے۔ اس لیے جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک اور مغائرت کے محرکات کا جائزہ لینے کے لیے ان کی شخصیت کا فہم ضروری ہے۔ لیکن یہ کام آسان نہیں۔ بقول پروفیسر سحر انصاری

> "بعض افراد کے بارے میں میرا یہ تجربہ رہا ہے کہ وہ سیدھی سادی اور خطِ مستقیم کی شخصیت نہیں ہوتے۔ ان میں ایک نوع کی پیچیدگی اور ژولیدگی ہوتی ہے۔ جون ایلیا بھی اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ خطِ مستقیم کی شخصیت نہیں تھے۔"[3]

اس لیے ان کی شاعری میں تشکیک اور مغائرت کے محرکات کا جائزہ لینے کے لیے ان کی شخصیت کی تشکیل میں کارفرما عوامل کا تجزیہ ضروری ہے۔ جن میں سے کئی ایک کا ذکر انہوں نے اپنے شعری مجموعہ شاید کے دیباچے نیاز مندانہ میں بڑی صاف گوئی سے کیا ہے۔

الف) خاندانی محرکات:

شخصیت کی تعمیر میں خاندان بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ جون ایلیا کا تعلق امروہہ کے ایک علمی اور ادبی گھرانے سے تھا۔ ان کی شخصیت کی نمو میں خاندان کے اثرات نمایاں ہیں۔ جن میں سے چیدہ چیدہ نکات بیان کیے جا رہے ہیں۔

i۔ والد کا عالمانہ استغراق

جون ایلیا کے والد علامہ شفیق حسن ایلیا ایک درویش منش عالم، فلسفی، شاعر، ہیئت دان، کئی زبانوں کے ماہر اور کئی علوم کے جامع تھے۔ بقول جون ایلیا ان کی عمر کے چون پچپن سال تصنیف و تالیف میں گزرے۔ (4)لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ انہیں مصوری کا بھی شوق تھا۔ بقول جون ایلیا

"وہ قلم کے ہی نہیں مو قلم کے بھی آدمی تھے۔ امام حسینؑ کے سفر کربلا کی منزلوں اور کربلا کے میدانِ واقعہ کے نقشے بھی بنائے تھے۔ انہوں نے جنت اور جہنم کا ایک نقشہ بنایا تھا۔ جس میں دونوں کے درجات کو رنگوں کی شدت سے واضح کیا تھا۔" (5)

کچی عمر میں رنگوں کی اس شدت اور پر اسراریت نے جون ایلیا کی نفسیات پر گہرے نقش مرتسم کیے۔ وہ شاید کے دیباچے میں لکھتے ہیں

"یہ دو بعدی جہنم ان کے ارتیابی، لاادری اور زندیق بیٹے جون کے حق میں سہ بعدی ہو گیا ہے۔ اور وہ اس جہنم کے درکِ اسفل میں جل رہا ہے، بھڑک رہا ہے، دھک رہا ہے لیکن راکھ نہیں ہو رہا۔" (6)

جون ایلیا نیاز مندانہ میں اپنے والد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ "میرا بستر، میری چادر، میرا تکیہ، میرا بکس اور میری الماری" (7) کی بجائے "ہماری زمین، ہمارا نظام شمسی اور ہماری کہکشاں" کا ذکر کرتے تھے۔ اور "عطارد، مریخ، زہرہ اور مشتری کا ذکر گھر کے افراد کی طرح ہوتا تھا۔" (8)

جون ایلیا لکھتے ہیں کہ میں بچپن میں بے آرامی کے ساتھ سوچا کرتا تھا کہ

"بابا کو زمین کی حرکت کے مسئلے کے سوا زمین کے کسی بھی مسئلے اور معاملے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں بچپن میں بے آرامی کے ساتھ اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ زندگی کے بارے میں بابا کا یہ رویہ ہمارے گھر کو تباہ و برباد تو نہیں کر دے گا۔ میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہتا تھا۔ میں نے سالہا سال بعد اسی کیفیت میں بابا کی ایک ہجو کہی۔" (9)

اس پیراگراف پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ظفر مراد آبادی لکھتے ہیں

"کسی باشعور بچے کے ذہن میں مذکورہ بالا باتوں کا آنا، پیچ و تاب کھانا اور اس حد تک پہنچ جانا کہ وہ اپنے والد کی ہجو لکھنے پر آمادہ ہو جائے۔ تربیت کی کجی کو واضح کرتا ہے۔ جذباتی طور پر بے توجہی ہی باغی جذبات پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔۔۔ 2007ء، ص16 جون اس نفسیاتی چوٹ سے زندگی بھر جوجھتے رہے۔" (10)

ii۔ والدہ کی محرومیاں

جون ایلیا کی بھتیجی شاہانہ رئیس نے اپنی کتاب "چچا جون" میں جون ایلیا کی والدہ نرجس خاتون کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی ہیں۔ جس کی تلخیص یہ ہے کہ نرجس خاتون عمر بھر بے توجہی کا شکار رہیں۔ وہ امروہہ کے ایک مولوی گھرانے کی تین بیٹیوں میں سب سے چھوٹی، انتہائی حساس اور حسین تھیں۔ سرخ و سپید رنگت کے باعث انہیں فرنگن کہا جاتا تھا۔ سجنے سنورنے کی شوقین تھیں لیکن گھر کے ماحول میں گھٹن تھی اس لیے ان کا کوئی شوق پورا نہ ہو سکا۔ ان کی بڑی بہن میٹھی کی شادی جون کے تایا نفیس حسن اور چھوٹی بہن فاطمہ کی جون کے والد شفیق حسن ایلیا سے ہوئی۔ جلد ہی فاطمہ ایک وبا کی نذر ہوئیں تو نرجس کی شادی ان سے پوچھے بغیر بہنوئی سے کر دی گئی۔ چونچال اور الھڑ نرجس خاموش ہو گئیں۔ افسوس، غم و غصے کا لاوا سلگنے لگا۔ غم و غصے کو باہر نکلنے کا رستہ نہ ملا تو ان کا ذہن بکھرنے لگا۔ (11) "تب انہیں اپنے آپ کو منوانے اور احتجاج کا ایک راستہ نظر آیا اور وہ تھا جن زدّگی"۔ (12)

جون کے تایا نفیس حسن کی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے جب جون کے سب سے بڑے بھائی رئیس امروہوی پیدا ہوئے تو وہ تایا کو دے دیے گئے۔ اس سے جون کی والدہ کی حالت اور خراب ہو گئی۔ شاہانہ رئیس ایلیا کے اپنے الفاظ میں

"اماں کے اندر جو محرومیاں گھاؤ بن گئی تھیں، گھٹن، غصہ اور اداسیاں تھیں، وہ سب مل ملا کر جون اصغر کے روپ میں پیدا ہو گئیں۔ گویا اماں کے یہاں جون کی شکل میں ظلمین پیدا ہو گیا۔ جو انتہائی کڑوا اور زہریلا تھا۔ اماں صدائے احتجاج نہ بلند کر سکیں

مگر تم سراپا احتجاج بن گئے، اماں اپنی تمام تر ناکامیوں اور بد نصیبی کو اوڑھ کر منوں مٹی کے نیچے جا سوئی اور تم ان کے دکھوں کے مجاور بن گئے۔" (13)

iii۔ ایک دیرینہ وعدے کی عدم تکمیل

زندگی کے بعض واقعات انسانی شخصیت پر بہت گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ ایک ایسا ہی واقعہ جون ایلیا کے ساتھ پیش آیا۔ شاید کے دیباچہ میں لکھتے ہیں

"موسم سرما کی ایک سہ پہر تھی، میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ بابا مجھے شمالی کمرے میں لے گئے۔ نہ جانے کیوں وہ بہت اداس تھے۔ میں بھی اداس ہو گیا۔ وہ مغربی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے کہا ایک وعدہ کرو میں نے کہا بابا! کیا وعدہ؟ انہوں کہا "یہ کہ تم بڑے ہو کر میری کتابیں ضرور چھپواؤ گے۔" میں نے کہا بابا میں وعدہ کرتا ہوں بڑا ہو جاؤں گا تو آپ کی کتابیں ضرور چھپواؤں گا مگر میں بابا سے کیا ہوا یہ وعدہ پورا نہیں کر سکا۔ اور میرے بابا کی تقریباً تمام تصانیف ضائع ہو گئیں یہی میرا وہ احساس جرم ہے میں اپنے کلام کی اشاعت سے گریزاں ہی نہیں متنفر رہا ہوں۔" (14)

جون ایلیا یہ وعدہ اس لیے پورا نہیں نہ کر سکے کہ بقول ان کے وہ بڑا نہیں ہو سکے۔ (15) اس جملے سے جون کے کرب اور احساسِ ندامت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس وعدے نے جون کو احساسِ بے بسی میں مبتلا کر دیا۔ بقول ڈاکٹر ظفر مراد آبادی جس عمر میں اس کا حوصلہ بلند ہونا چاہیے تھا، یاسیّت سے دوچار ہو کر احساسِ ملال سے اٹ گیا۔ (16)

کتابیں نہ چھپوا سکنے کے باعث وہ احساسِ جرم سے دبتے چلے گئے۔ ان کے اپنے بقول بہت سے احباب نے کوشش کی کہ میرا مجموعہء کلام چھپے لیکن میں کسی سے تعاون ہی نہیں کرتا تھا۔(17) تقریباً انسٹھ برس کی عمر میں ان کا پہلا شعری مجموعہ شاید کے نام سے چھپا، لیکن تب تک بقول ان کے وہ رائیگاں ہو چکے تھے

"یہ میرا پہلا مجموعہ کلام یا شاید پہلا اعتراف شکست ہے جو انتیس تیس برس کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ ایک ناکام آدمی کی شاعری ہے۔ یہ کہنے میں بھلا کیا شرمانا کہ میں رائیگاں گیا۔" (18)

iv۔ پراسرار ماحول

امروہہ اولیا کا مسکن ہے۔ اس کے چپے چپے پر اولیا کے مزارات ہیں۔ ان میں شرف الدین شاہ ولایت کے مزار کو ثقافتی مرکزیت حاصل ہے۔ جون ایلیا امروہہ کے محلہ شاہ ولایت میں رہتے تھے۔ یہ مزار بچھوؤں والا مزار بھی کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے احاطے میں آج بھی بچھو نہیں کاٹتا۔ جون کا بچپن اسی کے اطراف میں کھیلتے ہوئے گزرا۔ یہیں بی بی بخوئی کی چوٹی یا درخت ہے۔ مشہور ہے کہ یہ شاہ ولایت کی بیٹی تھیں۔ جب ان کے لیے کسی نواب کا رشتہ آیا تو انہیں بڑی شرمندگی ہوئی کہ ایک درویش کی بیٹی کے لیے نواب کا رشتہ آیا ہے۔ انہوں نے دعا کی زمین پھٹی اور وہ اس میں سما گئیں۔(19) جون ایلیا نے اپنی نظم رمز ہمیشہ میں اس یقین پرور ماحول کی خوبصورت نقشہ کشی کی ہے۔ لیکن جب جون ایلیا نے فلسفے کا مطالعہ شروع کیا تو اس یقین کا طلسم ٹوٹنے لگا اور ذات سے کائنات تک ہر چیز سوالیہ نشان بنتی چلی گئی۔

ب) سیاسی و سماجی محرکات:

جون ایلیا کی اٹھان کا عہد سیاسی اور سماجی حوالے سے ایک ہنگامہ خیز دور تھا۔ انگریز ہندوستان سے جا رہا تھا۔ ملک کی تقسیم اور پھر ہجرت نے جون ایلیا کو جون ایلیا کو بری طرح متاثر کیا۔ اس کا اظہار وہ اخیر عمر تک کرتے رہے۔ سقوط ڈھاکہ اور کراچی کے دگرگوں حالات کچھ کم جان لیوا نہیں تھے۔ اس لیے ان کا تفصیلی مطالعہ ضروری ہے۔

i۔ ہجرت

جون ایلیاہندوستان کی تقسیم کے مخالف تھے۔ لیکن سن سنتالیس میں ان کی خواہش کے برعکس ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ ان کے تینوں بھائی کراچی آ گئے۔ جون والدین اور چھوٹی بہن کے ساتھ امروہہ ہی میں رہے۔ جون ایلیا کی بھتیجی شاہانہ رئیس اپنے مضمون شاخِ ویراں کا مغنی میں لکھتی ہیں

"اماں اپنے بیٹوں کو یاد کر کے روتیں اور ان کے آنسو جون کے دل پر گرتے۔ الغرض ماں کا انتقال ہو گیا۔ اپو (شاہ زنان نجفی) کی شادی ہو گئی۔ چچا کے ذہن میں یہ خیال جم کر رہ گیا کہ اماں کو بھائیوں کے غم نے مار دیا۔۔۔" (20)

جنوری 1956ء جون کے والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ جون ایلیا گھر میں اکیلے رہ گئے۔ 1957ء میں وہ کراچی ہجرت پر مجبور تو ہو گئے لیکن شاہانہ رئیس کے بقول "تب تک تنہائی اور اداسی کا کرب ان کی روح کو گھائل کر چکا تھا۔۔۔ احساس کی شدت نے ان کا سینہ اور پھیپھڑے چھلنی کر دیے تھے۔" (21) ارضیت اور بے زمینیت انہیں مار گئی۔ شاید کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں

"مجھے نہیں معلوم کہ شمالی ہند کے پہلے مثنوی نگار سید اسماعیل امروہوی، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، نسیم امروہوی، سید محمد تقی، سید صادقین، محمد علی صدیقی اور اقبال مہدی نے امروہہ چھوڑ کر اپنے آپ کو کم بخت محسوس کیا تھا یا نہیں مگر میں نے ۔۔۔ بہر حال" (22)

اس جملے کے ادھورے پن سے درد کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جون ایلیا سے پہلے اقبال مہدی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، رئیس امروہوی، سید محمد تقی، صادقین، سید قمر رضی اور دیگر بہت سے کراچی میں تھے لیکن "وہ امروہہ کی کہکشاں کے ٹوٹے ہوئے ستارے تھے۔ وہ کراچی میں آ کر بھی کہکشاں سے الگ رہے۔" (23) یہ کیفیت ان کے شاعرانہ کرب کی ایک بڑی وجہ ہے۔ بقول شاہانہ رئیس "تم (جون ایلیا) بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتہ نہ کر سکے اور یادوں کے مزار کے مجاور بن کر رہ گئے"۔(24) جون ایلیا کی شاعری میں اس ہجرت کے کرب کا اظہار بڑی شدت اور کثرت سے ہوا ہے۔

یادیں ہیں یا بلوہ ہے

چلتے ہیں چاقو مجھ میں(25)

کیا پوچھتے ہو نام و نشانِ مسافراں
ہندوستاں میں آئے ہیں ہندوستاں کے تھے (26)

اس سمندر پہ تشنہ کام ہوں میں
بان تم اب بھی بہہ رہی ہو کیا؟ (27)

مت پوچھو کتنا غمگین ہوں گنگا جی اور جمنا جی!
میں جو تھا اب میں وہ نہیں ہوں، گنگا جی اور جمنا جی ! (28)

ii۔ سیاسی اور سماجی انتشار

جون ایلیا پاکستان میں سیاسی اور سماجی انتشار سے برہم تھے۔ عباس نقوی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ 1971ء کے بعد مشرقی پاکستان کے سقوط کے پیش نظر ٹوٹ پھوٹ گئے۔[29] پاکستان میں سیاسی جبر انہیں مشتعل رکھتا تھا۔ فوزیہ شاہین کو ایک انٹرویو میں وہ کہتے ہیں کہ "یہاں لوگوں پر جو جبر ہوا جو قتال ہوا وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اس سلسلے میں مقتدرہ اور اہل مذہب کا گٹھ جوڑ بھی انہیں ایک نظر نہیں بھاتا تھا۔ اس کی تفصیل انہوں نے اپنی نظم شہر آشوب میں دی ہے۔ اس نظم کے آخری دو اشعار دیکھئے

گزشتہ عہد گزرنے ہی میں نہیں آتا
یہ حادثہ بھی لکھو معجزوں کے خانے میں
جو رد ہوئے تھے جہاں میں کئی صدی پہلے
وہ لوگ ہم پہ مسلط ہیں اس زمانے میں (30)

اسلامائزیشن کے مدعی جنرل ضیا الحق کی بارے میں وہ کہتے ہیں کہ

نسبت علم ہے بہت حاکم وقت کو عزیز

اس نے تو کارِ جہل بھی بے علما نہیں کیا [31]

کراچی کی ابتر صورت حال ان کے لیے سوہان روح تھی۔ ان کے بڑے بھائی رئیس امروہوی دہشت گردی کا شکار ہوئے۔ ایک مشاعرے میں ایم کیو ایم کے بانی الطاف حسین کے آمد پر نہ کھڑے ہونے پر ان کی تذلیل کی گئی۔[32]

ج) خانگی محرکات:

خاندانی اور سیاسی اثرات کے باوجود جون ایلیا کی زندگی کسی نہ کسی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن وہ خانگی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے متحمل نہیں تھے۔ زاہدہ حنا کے ساتھ شادی ، علاحدگی اور بچوں سے دوری نے ان کی صحت اور شخصیت کو بری طرح متاثر کیا۔

i۔ ناکام ازدواجی زندگی

آٹھ برس کی عمر میں پہلا عشق ہوا۔[33] اس کے بعد کئی معاشقے ہوئے۔[34] آخر 1970ء میں زاہدہ حنا سے ان کی شادی ہوئی۔ جون کی خواہش کے برعکس زاہدہ حنا ادب سے وابستہ رہیں۔ اور زاہدہ کے اصرار کے باوجود جون ایلیا اپنی عادات نہ بدل سکے۔[35] 1980ء کی دہائی کے وسط میں ان کی طلاق ہو گئی۔ زاہدہ حنا لکھتی ہیں

"زندگی کی حقیقتوں سے ناتہ نہ جوڑنے اور محض کتابی ماحول میں سانس لینے کے سبب جون ایلیا نے ابتدائے عمر سے ہی ایک فرضی دنیا آباد کی۔۔۔ وہ عہد نامہء عتیق کے سحر میں تھے اور آج تک اس سحر سے آزاد نہ ہو سکے۔" [36]

انور احسن صدیقی اپنی خود نوشت " دل پر خوں کی اک گلابی سے " میں لکھتے ہیں

"جون مزاجاً ایک لابالی، منتشر الخیال، حقائقِ زندگی سے سامنا کرنے سے گریزاں اور بہت سے اندرونی تضادات اور باطنی پیچیدگیوں کا شکار تھے۔۔۔ وہ اگر شادی نہ

کرتے تو زیادہ بہتر زندگی گزار سکتے تھے۔۔۔جون کی ذاتی زندگی ایک پر پیچ المیہ تھی۔
۔۔ان کے اندر کسی کو چاہنے سے زیادہ چاہے جانے کی خواہش ہمیشہ شدت سے
موجود رہی۔'' (37)

ii۔ اولاد سے علاحدگی

1994ء میں زاہدہ نے رنگ و روغن کے بہانے جون ایلیا کو کوٹھی (رئیس امروہوی کا گھر جو چاروں بھائی کی مشترک ملکیت تھا) میں بھیج دیا(38) اور پھر جون ایلیا اپنے گھر کبھی نہ لوٹ سکے۔ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔جون ایلیا کو اس کی بڑی بیٹی کی شادی میں شریک نہیں ہونے دیا گیا اور شادی کارڈ میں ولدیت کا خانہ خالی رکھا گیا۔(39) انور احسن صدیقی کے بقول

''طلاق کے بعد سے جون اور بھی زیادہ احساسِ محرومی، اندرونی کرب اور رقیق القلبی
کا شکار ہو گئے۔ وہ بات بات پر رونے لگتے۔۔۔ایک مرتبہ فون پر مجھ سے کہا تھا کہ
انور تم خوش قسمت ہو کہ تمہاری اولاد نہیں ہے۔ میری اولاد نے مجھے جوتے مار کر گھر
سے نکال دیا۔'' (40)

ایک مرتبہ جون کا سامنا اس کے بیٹے زریون سے ہو گیا لیکن وہ منہ پھیر کر نکل گیا۔جون ایلیا کے دوسرے شعری مجموعہ یعنی میں شامل ان کی معروف طویل نظم درختِ زرد اسی واقعے کی یادگار ہے۔ (41) ایک حد درجہ حساس باپ اپنے بیٹے کی اس بے رخی سے جس قدر متاثر ہوا اس کا اندازہ یہ نظم پڑھ کر بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ بعض مصرعوں میں جون کے لہجے کی کرختگی گرچہ ان کی تلخ زندگی کی عکاس ہے۔اس سب نے ان کی صحت کو بری طرح متاثر کیا۔ گفتگو کے دوران وہ ہانپنے لگتے تھے۔ معمولی چلنے سے ان کی سانسیں پھول جاتی تھیں۔ یہ ان کی اخیر عمر کا واقعہ ہے۔اس کے کرب سے وہ اعصابی طور پر مزید کمزور ہوتے چلے گئے۔

د) مثالیہ پسندی:

جون ایلیا کاملیت پسند یعنی پروفیکشنسٹ تھے۔ ہر چیز کو انٹلکچولائز کرتے تھے۔اس لیے میدانِ عمل سے کٹتے چلے گئے۔نہ اپنی شاعری سے مطمئن ہو سکے نہ زندگی سے۔وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔بقول ان کے

"جس بیٹے کو اس کے انتہائی خیال پسند اور مثالیہ پرست باپ نے عملی زندگی گزارنے کا کوئی طریقہ نہ سکھایا ہو بلکہ یہ تلقین کی ہو کہ علم سب سے بڑی فضیلت ہے اور کتابیں سب سے بڑی دولت تو وہ رائیگاں نہ جاتا تو کیا ہوتا"۔ (42)

جون ایلیا کی طبیعت عمر بھر خوب سے خوب تر کی جویا رہی۔ ایک انٹرویو میں کہتے ہیں

"میں کاملیت کی تلاش میں تباہ ہو گیا۔ میں نے تیس برس اپنی شاعری اس لیے نہیں چھپوائی کہ میں اس سے مطمئن نہیں تھا۔ مجھے اگر موقع ملے تو میں اپنی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شاعری دوبارہ لکھوں۔" (43)

جون ایلیا کے بقول وہ جو تاج محل بنانا اور عجائبات تخلیق کرنا چاہتا تھا وہ پورے طور پر نہیں ہو سکے۔ (44) ایسا کیوں نہیں ہو سکا؟ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے علی احمد فاطمی لکھتے ہیں

"ایسا شاعر جس نے ایک مخصوص و مضبوط علمی و تہذیبی پس منظر پایا ہو، طرح طرح کے علم حاصل کیے ہوں، حیات و کائنات کے تعلق سے ایک خوشگوار اور صحت مند تصور قائم کیا ہو، لیکن دنیا اس کے مزاج و معیار کے برعکس غلیظ ہو، تقلیب و تخریب کا شکار ہو تو آبگینوں کو ٹھیس لگ جانا اور بیزاریوں اور پیچیدگیوں کا پیدا ہو جانا عین فطری ہے۔" (45)

سفر کی اس رائیگانی کا اظہار جون نے اپنے اس مشہور شعر میں بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

جون کرو گے کب تلک اپنا مثالیہ تلاش

اب کئی ہجر ہو چکے' اب کئی سال ہو گئے (46)

جون ایلیا کی زندگی اور شخصیت کے تفصیلی مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ان کی منفیت پسندی کی کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔ جون ایلیا کے ذہنی و فکری پس منظر پر طویل بحث کے بعد سید محمد تقی موضوع کو سمیٹتے ہوئے کہتے ہیں کہ " دیگر محرک اپنی جگہ لیکن اگر جون ایلیا کے ذہن کو مرکز نہ مانا جائے تو تمام تعبیرات غلط ہو جائیں گی"۔ (47) مبین مرزا ان کے طرزِ زیست اور وضعِ سخن پر اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ " نمو پذیری

کے کسی ابتدائی دورانیے ہی کے کسی مرحلے پر ذہنی تنہائی کے شدید احساس نے انہیں آلیا "۔ (48) جس نے وقت گزرنے کے ساتھ انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ "وہ مزید لکھتے ہیں کہ ان کے خواب ان کی بساط سے بڑے تھے۔ ان کی تعبیر میں حائل رکاوٹوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کی بجائے انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔" (49)

جون ایلیا کے یہاں تشکیک اور مغائرت کے محرکات ہمہ جہت ہیں۔ وہ ایک پیچیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ پروفیسر سحر انصاری ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ صراطِ مستقیم کی شخصیت نہیں تھے۔ اس لیے ان کی منفیت پسندی کے محرکات کا درست تعین آسان نہیں ہے۔ ان کے کلام میں میں تشکیک اور مغائرت کے محرکات بہت سے ہیں۔ خاندانی محرکات میں ان کے والد کا عالمانہ استغراق، والدہ کی محرومیاں جن کا براہ راست اثر جون ایلیا کی شخصیت پر پڑا۔ اپنے والد سے ان کی کتابوں کی اشاعت کے دیرینہ وعدے کی عدم تکمیل جس نے انہیں پوری زندگی زیرِ بار رکھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنا کلام تک بروقت نہ چھپوا سکے۔ امروہہ کا پر اسرار اور طلسماتی ماحول جس کی تفصیل انہوں نے اپنی نظم رمز ہمیشہ میں بیان کی ہے۔ جہاں معجزات اور مکاشفات روز کا معمول تھے۔ وہ سید ولایت شاہ کی اولاد تھے جن کے مزار کو امروہہ میں اوّلیت اور مرکزیت حاصل تھی۔ جہاں بچھو اپنی فطرت بھول جاتا ہے اور انسان کو ڈنک نہیں مارتا۔ ان کی تشکیکی فکر کی تشکیل میں سیاسی و سماجی محرکات کا عمل دخل بھی گہرا ہے۔ جن میں ہندوستان کی تقسیم نمایاں ہے۔ وہ تقسیم کے مخالف تھے۔ لیکن یہ تقسیم ہو کر رہی۔ ان کے دو بھائی کمیونسٹ تھے۔ یوں انگریز سامراج سے نفرت انہیں گھر سے ملی۔ ان کے بھائی سیّد محمد عباس انہیں انقلابیوں کے واقعات سناتے اور بم بنانے کی تراکیب بتاتے تھے۔ پھر انہیں ہجرت کا دکھ جھیلنا پڑا۔ انہوں نے بوجھل قدموں سے امروہہ کو خیر باد تو کہہ دیا لیکن وہ تصورات میں ہندوستان میں ہی رہے اور کئی مرتبہ اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ پاکستان آکر انہیں جس سیاسی اور سماجی انتشار سے گزرنا پڑا وہ ان کے لیے جان لیوا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علاحدگی، پے در پے مارشل لا، اور پھر شہر کراچی کا آشوب انہیں لے ڈوبا۔ ان کے لیے ایک بہت بڑا روگ ان کی ناکام ازدواجی زندگی تھی۔ انہیں روشنی سے ڈر لگتا تھا۔ اس لیے وہ طویل عرصہ تک ایک نیم تاریک کمرے میں تنہا پڑے رہے۔ اس دوران ان کی بیٹی کی

شادی ہوئی جس پر لڑکی کی ولدیت تک لکھی ہوئی نہیں تھی۔ اولاد سے علاحدگی کچھ کم جان لیوا نہیں تھی۔ ایک مرتبہ ان کی نظر ان کے بیٹے زریون پر پڑ گئی لیکن اس نے نظر پھیر لی۔ اس واقعہ نے انہیں بری طرح متاثر کیا۔ ان کے دوسرے مجموعہ کلام "یعنی" کی نظم "درختِ زرد" اسی واقعے کی یادگار ہے۔ ان کی مثالیہ پسند طبیعت بھی تشکیک اور مغائرت کے محرکات میں شامل ہیں۔ گویا ان کی منفیت پسندی کی کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔ لیکن ان کے قریبی رشتہ داروں، عزیزوں اور دانشوروں کی آرا کا لب لباب بیان کیا جائے تو ان کی منفیت پسندی کا سب سے بڑا محرک خلقی دکھائی دیتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ احمد جاوید، جون ایلیا کے بارے میں جناب احمد جاوید صاحب کی گفتگو، مرتب: عاصم رضا، http://jaeza.pk، 15 جولائی 2020ء، 09:12pm

2۔ ایضاً

3۔ سحر انصاری، (فلیپ) خوش گزراں گزر گئے، از نسیم سید، اکادمی بازیافت، کراچی، طبع اول، 2011ء

4۔ جون ایلیا، شاید، (دیباچہ)، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، طبع ہفتم 1998ء، ص15

5۔ ایضاً، ص15

6۔ ایضاً، ص16

7۔ ایضاً، ص16

8۔ ایضاً، ص16

9۔ ایضاً، ص16

10۔ ظفر مراد آبادی، ڈاکٹر، جون ایلیا۔ ایک تاثر، (مضمون) مشمولہ: ادبی شخصیات، بزم شیراز، دہلی، 2007ء، ص17

11۔ شاہانہ رئیس ایلیا، چچا جون، فضلی سنز، کراچی، طبع دوم، 2017ء، ص34

12۔ ایضاً، ص32

13۔ ایضاً، ص38

14۔ جون ایلیا، شاید، (دیباچہ)، ص16

15۔ جون ایلیا، شاید، (دیباچہ)، ص16

16۔ ظفر مراد آبادی، ڈاکٹر، جون ایلیا۔ ایک تاثر، (مضمون) مشمولہ: ادبی شخصیات، ص17

17۔ جون ایلیا، شاید، (دیباچہ)، ص12

18۔ ایضاً، ص12

19۔ شاہانہ رئیس ایلیا، چچاجون، ص27

20۔ شاہانہ رئیس، شاخ ویراں کا مغنی، (مضمون) مشمولہ: میں یامیں، ص416

21۔ ایضاً، ص417

22۔ جون ایلیا، شاید، ص14

23۔ ایضاً، ص14

24۔ چچاجون، ص 34

25۔ جون ایلیا، شاید، ص211

26۔ جون ایلیا، یعنی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2004ء، ص 115

27۔ جون ایلیا، شاید، ص149

28۔ جون ایلیا، لیکن، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2014ء، ص180

29۔ جون ایلیا، عالمِ سکرات میں بھی شہر کہہ سکتا ہوں میں، (انٹرویو) مشمولہ: میں یامیں، ص728

30۔ جون ایلیا، شاید، شہر آشوب (نظم)، ص46

31۔ جون ایلیا، شاید، ص223

32۔ خرم سہیل، صاحبِ اسلوب-جون ایلیا، قرطاس ادب، روزنامہ جنگ، کراچی، 7نومبر 2018ء،

33۔ شاید، جون ایلیا، ص17

34۔ شاہانہ رئیس ایلیا، چچاجون، ص51

35۔ نیہا اقبال، جون ایلیا–حیات اور شاعری، ورثہ پبلی کیشنز، کراچی، 2019ء، ص53

36۔ زاہدہ حنا، اپنی کربلا کی تلاش میں، (مضمون) مشمولہ: میں یامیں، مولف خالد احمد انصاری، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2020ء، ص326

37۔ انور احسن صدیقی، دل پر خوں کی اک گلابی سے، شہر زاد، کراچی، 2012ء، ص263

38۔ شاہانہ رئیس ایلیا، چچاجون، ص61

39۔ ایضاً، ص62

40۔ انور احسن صدیقی، دل پر خوں کی اک گلابی سے، ص265

41۔ ایضاً، ص265

42۔ جون ایلیا، شاید، ص11

43۔ جون ایلیا، مجھے اپنی شاعری پر اعتماد نہیں، (انٹرویو) مشمولہ: میں یا میں، ص744

44۔ ایضاً، ص745

45۔ علی احمد فاطمی، ڈاکٹر، جون ایلیا-بیزاری و بغاوت کا شاعر، (مضمون) مشمولہ: خوش گزراں گزر گئے، ص37

46۔ جون ایلیا، شاید، ص اپنا مثالیہ تلاش

47۔ سید محمد تقی، ذہنی و فکری پس منظر، (مضمون) مشمولہ: میں یا میں، مرتب خالد احمد انصاری، ص 379

48۔ مبین مرزا، طرزِ زیست اور وضعِ سخن، خوش گزراں گزر گئے، نسیم سید، ص71

49۔ ایضاً، ص69

باب سوم

جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک: تجزیاتی مطالعہ

الف) تشکیک کا مفہوم و روایت:

عام گفتگو میں لفظ تشکیک گمان، شک، ریب اور زن کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لغتِ کشوری میں تشکیک کے معنی "کسی کو شک میں ڈالنا" ہیں۔[1] قاموس الاصطلاحات کے مطابق "مذہبِ شکا کیون، شکا کیت، لاادریت، شک پرستی"[2] فرہنگ ادبیات کے مطابق "مظاہر کے وجود کے متعلق فکر کا یقین و گمان کے بیچ معلق ہونا۔ ہے یا نہیں ہے کی حالت"[3] فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ میں تشکیک کے لیے ارتیابیت کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔[4] کلیم الدین احمد نے فرہنگ ادبی اصطلاحات میں skepticism کو تشکیک اور مسلک تشکیک لکھا ہے۔[5] گویا فلسفہء تشکیک تمام رائج الوقت فلسفوں اور اقدار کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے تا کہ حقیقت کی ماہیت تک پہنچا جا سکے۔ اس کے لیے وہ ہر قسم کے سوالات اٹھاتا ہے۔ حتیٰ کہ متشکک کی اپنی ذات بھی ان سوالات سے نہیں بچ سکتی۔ کل انسانی ترقی انہیں تشکیکی سوالات اور کرید کا نتیجہ ہے۔ متشککین کسی بھی فلسفی، مصلح کی بات پر سر تسلیم خم کرنے اور اسے بلا چوں وچرا ماننے کی بجائے اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اس عمل کو جتنا برا سمجھا جاتا ہے، یہ اتنا برا ہے نہیں اور ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہے۔ کوئی بھی چیز خریدتے ہوئے، رشتے ناتے طے کرتے ہوئے ہم اچھی طرح تحقیق کرتے ہیں کہ کہیں دھوکہ نہ ہو جائے۔ اپنے لکھے کو ترچھی نظر سے دیکھتے ہیں کہ کچھ غلط نہ لکھ لیا ہو، اپنے کپڑوں پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں کہ سب ٹھیک تو ہے۔ سنگی دور سے ڈیجیٹل دنیا کا تمام سفر ایسے ہی طے ہوا ہے۔ لیکن مذہبی معاشرت میں تشکیک ہمیشہ سے ایک معتوب عمل رہا ہے۔ متشکک کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور اسے مرتد اور ملحد ایسے خطابات دیے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ عمل محض سوال برائے سوال کے لیے نہیں

ہے بلکہ کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہے۔یہی فکری آزادی تشکیک یا ارتیابیت کہلاتی ہے اور اس کے مقابل سوچ یعنی مسلمات پر سوالات کی اجازت نہ دینے کا نام ادعائیت ہے۔۔ دونوں ایک دوسرے کا الٹ ہیں۔ یہ دونوں مختلف دنیائیں ہیں۔ ایک میں جستجو اور اضطراب اور دوسرے میں سکون اور قرار ہے۔ تاریخ انسانی ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے جو عمر بھر اصل تک پہنچنے کی جستجو میں رہے۔ سہولت کے لیے انہیں تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

i۔ تشکیک کی صوفیانہ روایت

تشکیک عقل اور مذہب وحی پر اپنی بنیاد رکھتا ہے۔ یہ دنوں حصولِ علم کے مختلف شعبے ہیں۔ ایک تسلیم ورضا اور دوسرا تحقیق و تصدیق کا تقاضا کرتا ہے۔ ایک میں جاننے اور دوسرے میں ماننے کی خو ہے۔ لیکن تقریباً تمام تہذیبوں میں صوفیانہ تشکیک کی مثالیں ملتی ہیں۔ ہندوستان میں اس کی بڑی مثال مہاتما بدھ ہیں۔ جو روشنی کی تلاش میں گہرے تفکر میں ڈوب گئے اور نتیجتاً لاادریت کا شکار ہو گئے۔ علامہ اقبال نے ری کنسٹرکشن آف ریلیجیس تھاٹ ان اسلام میں خود پیغمبر اسلام کے دور میں اسلام کی عقلی بنیادوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

> ”کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی عقلی بنیادوں کی تلاش کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تواتر سے یہ دعا فرمایا کرتے تھے،۔”اللہ ! مجھے اشیا کی اصل حقیقت کا علم عطا فرما“۔ آپ کے بعد صوفیا اور غیر صوفی متکلمین نے اس ضمن میں جو کام کیا وہ ہماری تاریخ ثقافت کا ایک روشن باب ہے کیونکہ اس سے ان کی افکار کے نظام سے دلچسپی ظاہر ہوتی ہے جو سچائی سے ان کی دلی یگانگت کی آئینہ دار ہے۔“ (6)

فتح ایران کے بعد اسلامی دنیا پہلی بار عجمی تصوف سے متعارف ہوئی۔ بنو امیہ کے جبر خصوصاً واقعہ کربلا کے بعد سریت عام ہو گئی۔ صوفیا شریعت کے ظاہر کی بجائے باطن کو اہمیت دینے لگے۔ فارسی صوفیا کے ساتھ ساتھ دیگر متصوف شعرا عمر خیام، حافظ شیرازی، عرفی اور نظیری کے ہاں تشکیک کے اشارے ملتے ہیں۔ لیکن تشکیک کی شدت عمر خیام کی شاعری میں ہے۔ ایک رباعی دیکھیے

اے آمدہ ! از عالمِ روحانی تفت
حیراں شدہ در پنج و چہار و شش و ہفت
مے نوش ندانی زکجا آمدہ ای
خوش باش ندانی بکجا خواہی رفت (8)

یعنی اے عالم ارواح سے آنے والے! اعداد کے چکر میں پڑے متحیر شخص!سب چھوڑ دے، شراب پی اور خوش رہ کہ تو نہیں جانتا کہ تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ اس رباعی سے عمر خیام کے ہاں تشکیک کی شدت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پندرہویں اور سولہویں صدی میں جب ہندوستان میں اردو تشکیل پا رہی تھی اس وقت یہاں ویدانت اور اپنشد کے زیر اثر وحدت الوجود یا ہمہ اوست کا نظریہ بہت مقبول تھا۔ آزاد خیال اور وسیع المشرب صوفیا نے اس کے زیر اثر وحدتِ ادیان کے تصور کو عام کیا۔ حقانی القاسمی اپنے مضمون اردو غزل میں کفر والحاد میں یوں رقم طراز ہیں:

"اس فلسفہ کی رو سے موجود صرف ایک ہے اور وہ اللہ کی ذات ہے اور اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ کائنات کا وجود خیالی ہے۔ اس کے ہر ذرے میں خدا کی نمود ہے۔ اس طرح کائنات خدا کے وجود کا حصہ ہے اور اس کے مظاہر خدا کی شکلیں ہیں۔ عرب دنیا میں اس تصور کی تشہیر اور تبلیغ محی الدین ابن عربی نے کی جبکہ ہندوستان میں اس فلسفے کے محرک سری شنکر ہیں۔ یہ نظریہ ویدانت اور اپنشد سے ماخوذ ہے۔" (8)

ہمہ اوست صوفی شعرا کا پسندیدہ موضوع رہا۔ اس کا آغاز دکن سے ہوا۔ لیکن ہمہ از اوست کے ماننے والوں نے اس رجحان کی مخالفت کی۔ جن میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا کہ "مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعرا نے عجیب و غریب اور بظاہر دل فریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے" (9) شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کے اس

دور میں بعض صوفی شعرا مثلاً میر دردؔ نے بڑے متوازن انداز میں تشکیک کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کے یہ اشعار دیکھیے

مدرسہ یا دَیر تھا، یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے تو ہی صاحب خانہ تھا (10)

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں (11)

ii۔ تشکیک کی فلسفیانہ روایت

تشکیک کا آغاز سوفسطائیوں کے اس نظریے سے ہوا کہ حقیقت کے بارے میں پیش کیا گیا کوئی بھی نظریہ اپنے پیش کرنے والے کے لیے سچ ہو گا۔ رواقیت اور اپی کیوریت نے مصائب سے نجات کے لیے الگ راستے تجویز کیے اور یوں نظریہ تشکیک کے ابھار کے لیے راہ ہموار کر دی۔ پرہو (Pyrrho) یونانی تشکیک کا بانی ہے۔ 360 ق م میں پیدا ہونے والا پرہو سکندر اعظم کا دوست تھا اور نظریات کی کھوج میں سکندر کی ہندوستان پر لشکر کشی کرنے والی فوج میں بھی شامل تھا۔ پرہو کی تشکیک بھی علمی نہیں بلکہ عملی نوعیت کی تھی اور مطمع نظر وہی ایک تھا کہ انسان کو مصائب و آلام سے نجات کیوں کر حاصل ہو۔ پرہو کے مطابق کسی نظریہ کی حمایت کرنی چاہیے، نہ ہی مخالفت، بلکہ غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ کیونکہ حقیقت کبھی منکشف نہیں ہو سکتی۔ ہر نظریہ کا رد موجود ہے۔ چنانچہ علم مطلق کا حصول ناممکن ہے۔ تشکیک کی فلسفیانہ لہر نے افلاطون کی اکیڈیمی کو بھی اپنی زد میں لے لیا۔ آرسی لاس (Arcesilaus) اکیڈیمی کا پہلا سربراہ ہے، جو تشکیک سے عملاً متاثر ہوا اور اکیڈیمی کا نام جدید اکیڈیمی (The New Academy) پڑ گیا۔

اولڈ اکیڈمی افلاطون کے اقوال، جب کہ جدید اکیڈمی افلاطون کے مکالمات سے متاثر تھی۔ ان اکیڈمیوں سے وابستہ فلسفیوں کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔ جو نقطہء نظر سامنے آتا تھا وہ اس پر سوال اٹھاتے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی بھی نقطہء نظر ٹھوس بنیادوں پر ہونا چاہیے۔ وہ افلاطون کے اس قول سے متاثر تھے

کہ ہر بات پر سوال اٹھاؤ۔ یہ سچائی کے منکر نہیں تھے لیکن سچائی کے ٹھوس جواز کا تقاضا کرتے تھے اور سچائی تک پہنچنے کے لیے اس کی پرکھ ضروری ہے۔ آرسی لس (Arcesilaus) کے بعد کارنیاڈس (Carneades) نئی اکیڈمی کا سربراہ بنا۔ وہ فلسفیوں کے اس سفارتی مشن میں شامل تھا جس نے روم میں یونان کی نمائندگی کی تھی۔ اس نے روم میں لیکچرز بھی دیے۔ یونانی فکر و فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کی بڑی تعداد نے ان لیکچرز کو سنا۔ کارنیاڈس نے اپنے پہلے لیکچر میں افلاطون اور ارسطو کے نظریہء عدل کے حق میں متاثر کن دلائل دیے۔ مگر اگلے دن اپنے پیش کردہ دلائل کی دھجیاں اڑادیں۔ تاکہ تشکیکی فکر کا ابلاغ ہو اور "نظریہء یقینِ کامل" کی بنیادیں ہلائی جاسکیں۔(12)

سترہویں صدی کے نصف اول میں ڈیکارٹ نے کہا تھا کہ میں صرف اتنا تسلیم کرتا ہوں کہ میں موجود ہوں۔ اور اس کا مجھے علم ہے۔ ڈیکارٹ کے اس نظریے کو ڈیوڈ ہیوم نے مزید فروغ دیا۔ اس نے کہا کہ حقیقت کا علم نہ کسی کو ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔(13)

مولانا عبدالماجد دریابادی یورپ میں انیسویں صدی میں تشکیکی فلاسفرز کی فکر کا ماحصل بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ "حقائق اشیا کا علم، حواس و عقل کے ذریعہ نہیں ہوتا، البتہ یومیہ زندگی کی عملی ضروریات کے لحاظ سے ہمیں مظاہر طبعی پر پورا اعتماد رکھنا چاہیے۔ اور جہاں عقل کی دسترس نہیں، وہاں اعتقاد کا سہارا ڈھونڈنا چاہیے"۔(14)

اگر تشکیک فلسفیانہ نہ ہو تو اس کی نوعیت عموماً نفسیاتی یا مریضانہ ہوتی ہے۔ ساختیات کے مطابق انسانی فکر کی تشکیل ایک پیچیدہ عمل ہے جس میں بہت سے عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ اس لیے جون ایلیا کی تشکیک مدبرانہ تھی یا مریضانہ اس کا فیصلہ اتنا آسان نہیں ہے۔

iii۔ تشکیک کی شاعرانہ روایت

ویسے تو تشکیک انسانی فطرت ہے اور اردو شاعری میں یہ شروع سے چلی آرہی ہے۔ حالی نے جب یہ شعر کہا ہو گا تو یقیناً ان کے ذہن میں آزادانہ روی کا پہلو بھی ہو گا

گنہگار تو چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے (15)

اردو شاعری خصوصاً غزل کا مزاج شروع سے سیکولر رہا ہے۔ واعظ پارسائی کی علامت ہے۔ وہ مسجد کی دعوت دیتا اور میکدے سے روکتا ہے، لیکن خود چوری چھپے وہیں جا نکلتا ہے۔ گویا اس کے ظاہر اور باطن میں تضاد ہے۔ اس کے مقابل شعرا نے رند، ساقی اور عاشق کو بہتر دکھایا ہے کیوں کہ ان کے کردار میں دوغلا پن نہیں ہے۔ تقریباً سبھی اردو شعرا نے اس کردار کو اپنے نشتروں کی زد میں رکھا ہے۔ اردو شاعری تشکیکی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اس میں ہر اس کام کی نفی ہے جو واعظ کہے۔ ایک باغیانہ روش عام ہے۔ سماجی پابندیوں کے باوجود شاعری میں تشکیک اور الحاد کے بہت سے مضامین علامتی انداز میں سامنے آئے۔ شیخ، زاہد، واعظ اور جبہ و دستار ظاہر پرستی کی علامتیں قرار پائیں۔ کہیں بتوں کی توصیف کی جا رہی ہے۔ کہیں کعبہ کو چھوڑ کر دیر آباد کیا جا رہا ہے۔ کبھی قشقہ کھینچ کر دیر میں بیٹھنے اور ترک اسلام کی بات کی گئی ہے۔ کسی نے کہا کہ کافر اگر وفادار ہو تو اسے کعبے میں گاڑنا چاہیے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا (16)

شادؔ عظیم آبادی کے یہ اشعار دیکھیے۔

اسیر جسم ہوں، معیادِ قید لا معلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم
سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم (17)

لیکن تشکیک کی واضح مثالیں غالبؔ کے کلام میں ملتی ہیں۔ فلسفیانہ تفکر کے باعث اس کے ہاں سوالیہ اور استفہامیہ اشعار کی کثرت ہے۔ یہ سلسلہ ع نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا، سے شروع ہوتا ہے اور دیوان کے آخر تک چلا گیا ہے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے(18)

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں(19)

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی (20)

علامہ محمد اقبالؔ اپنی اسلامی اور ملی شاعری کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں لیکن وہ تشکیک کے دور سے گزر کر وہاں تک پہنچے ہیں۔ ان کی نظم شکوہ تشکیک کی شاہراہ پر سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کے اس نوع کے کلام پر انور شیخ، "اقبال ایک اسلام شکن شاعر" کے نام سے کتاب شائع کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں علامہ کی نظم "محاورہ مابین خدا و انسان" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نو شینہ سازم (21)

تو نے شب بنائی میں نے چراغ بنایا، تو نے مٹی بنائی میں نے پیالا بنالیا۔ میں وہ ہوں جس نے سنگ سے آئینہ اور زہر سے تریاق بنایا۔

علامہ اقبالؔ کے بعد اردو شاعری میں کچھ بڑے نام آتے ہیں جو زندگی کو اپنے انداز سے دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان میں ایک اہم نام ن م راشد کا ہے۔ سنجیدہ تفکر سے وہ جس نتیجے پر پہنچے اس کا اظہار "دریچے کے قریب" کے پہلے حصے میں دیکھا جا سکتا ہے

آ مری جان! مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے!
اپنے بیکار خدا کی مانند اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا املائے حزیں،
ایک عفریت اداس، تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی (22)

دینِ بزرگاں کے ایک بڑے منحرف جوشؔ ملیح آبادی تھے۔ مکالمات جوش، مکاتیب جوش اور کلیات جوش میں اس حوالے سے بہت زیادہ مواد موجود ہے۔ یہاں صرف ایک شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شبیر حسن خاں نہیں لیتے بدلہ!
شبیر حسن خاں سے بھی چھوٹا ہے خدا؟ (23)

اس سلسلے میں ایک اہم نام فیض احمد فیضؔ کا ہے۔

یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط، بھوک اگا کرتی ہے (24)
مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے (25)

اب زمین پر کوئی گوتم ، نہ محمدؐ ، نہ مسیحؑ

آسمانوں سے نئے لوگ اتارے جائیں [26]

ان مثالوں سے واضح ہے کہ کلاسیکی شعرا کے ہاں یہ فکر علامتی، طنزیہ اور لطیف پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ کچھ شعرا جو خود شراب وغیرہ نہیں پیتے انہوں نے روایت نبھاتے ہوئے ایسے اشعار کہے ہیں اور شیخ و واعظ کو تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ بہت سے شعرا ایسے بھی ہیں جنہوں نے روایت کی بجائے ایک موقف کے طور پر شیخ و ملاّ پر تنقید کی ہے۔ جون ایلیا کے ہاں یہ رنگ بہت تیکھا، کاٹ دار اور گہرا طنز لیے ہوئے ہے۔ انہوں نے ایک ادرش کے طور پر ادعائیت اور اس سے جڑی چیزوں کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔

ب) جون ایلیا کے تعقل کا سفر:

شعر العجم میں مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ

> "فلسفہ حقائقِ اشیا کا ادراک ہے۔ یہ کیا چیزیں ہیں؟ کیوں وجود میں آئیں؟ کس چیز سے حاصل ہوئیں؟ مفرد ہیں کہ مرکب ہیں؟ ان کی ذاتیات، خواص اور لوازم کیا ہیں؟" [27]

غزل کی تنقید کی اصطلاحات میں ظہیر رحمتی لکھتے ہیں کہ فلسفہ قیاس پر مبنی ہوتا ہے اور کسی چیز کی حتمیت کا قائل نہیں ہے۔ جب کہ شاعری میں فلسفہ کائنات اور انسان کے رشتوں کی تفہیم سے عبارت ہے۔ [28] تعقل اور تفہیم کا یہ عمل انسان میں یقین و گمان جیسے متضاد تصورات اجاگر کر دیتا ہے۔ جو فنکار کو اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے۔ [29]

جون ایلیا کی بنیادی شناخت شاعر کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں فلسفے سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے والد اور بھائی فلسفی تھے۔ وہ خود بھی فلسفے کے طالب علم رہے ہیں۔ جون ایلیا کا سفر یقین سے شروع ہوتا ہے لیکن تعقل کے نتیجے میں تشکیک اور لاادریت سے ہوتا ہوا الحاد تک چلا جاتا ہے۔ ان مراحل کی تفصیل انہی عنوانات کے تحت بیان کی جاتی ہے۔

i۔ یقین

جون ایلیا کے پہلے مجموعہ کلام شاید کی چوبیسویں نظم رمزِ ہمیشہ ان کے تعقل کا سفر نامہ ہے۔ ایک سو چونسٹھ مصرعوں پر مشتمل یہ نظم شاعر کی تشکیکی فکر کی تشکیل کی تفہیم میں اساسی اہمیت کی حامل ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں شاعر نے اپنی حیات کے سعد ادوار کے خوش ماجرا روز و شب کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب خواب اور حقیقت کا فرق ختم ہو گیا تھا۔ وہ ایک طلسماتی یقین کے سحر میں گرفتار تھے۔ اندھا دھند یقین نے انہیں ماسوا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ایک الوہی احساس سے وہ ہمہ وقت سرشار رہتے تھے۔ کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا اور اگر ہو بھی جائے تو جوابات ملنا شروع ہو جاتے۔ جون ایلیا محلہ دربار شاہ ولایت، امروہہ، میں پیدا ہوئے۔ جون ایلیا انہی شاہ صاحب کی آل سے تھے۔ ان کا بچپن اور لڑکپن اسی دربار کے احاطے میں کھیلتے ہوئے گزرا۔

شام ہوئی ہے یار آئے ہیں یاروں کے ہمراہ چلیں
آج وہاں قوالی ہو گی ، جون چلو درگاہ چلیں (30)

نظم رمزِ ہمیشہ کے پہلے حصہ میں شاعر ایک تازہ معجزے کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک دیوان خانہ میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ ابن سکیت کا ذکر ہو رہا ہے۔ اتنے میں ایک بزرگ تشریف لاتے ہیں اور حالتِ گریہ میں فرماتے ہیں کہ آپ لوگوں نے عزا خانہ شاہ مسکین میں ہونے والے آج کے معجزے کے بارے میں سنا ہے؟ وہاں ایک نوجوان جاں کنی کی حالت میں لایا گیا۔ اس پر جب علم پھیرا گیا تو وہ دفعتاً اٹھ بیٹھا۔ یہ معجزہ سن کر کسی کو کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ جیسے یہ وہاں کا معمول ہے۔ شاعر اس دور کے خوش ماجرا روز و شب کی نقشہ کشی کرتے ہوئے کہتا ہے

وہ خجستہ وہ خوش ماجرا روز و شب
روز و شب ہی نہ تھے
اک زمانِ الوہی کا انعام جاری تھے

اور ایک رمزِ ہمیشہ کا

سرچشمہ جاوداں تھے

وہ سرچشمہ جاوداں جس کی تاثیر سے

اپنا احساسِ ذات ایک الہام تھا

جس سے روحِ در و بام سرشار تھی

اس فضا میں کوئی شے فقط شے نہ تھی

ایک معنی تھی

معنی کا فیضان تھی

کتنا شفاف تھا روح کا آسماں

کتنی شاداب تھی آگہی کی زمیں

ہم کو اپنا نسب نامہ تا آدمِ بوالبشر یاد تھا

قبلِ تاریخ کی ساری تاریخ ذہنوں میں محفوظ تھی (31)

شاعر خدا سے مخاطب ہے کہ وہ کیا خوش بخت دور تھا جب میں تجھ سے معمور و مسحور تھا۔ ہر طرف تیری ذات کی جلوہ گری تھی۔ کوئی چیز بے معنی اور بے مقصد نہ تھی۔ ہر لفظ معنویت اور مقصدیت لیے ہوئے تھا۔ ہر طرف فیض کا ہن برستا تھا۔ شاعر کی روح تک روایتی افکار سے منور تھی اور وہ آبائی فکر پر نازاں تھا۔ اسے اپنا نسب نامہ حضرت آدم تک یاد تھا۔ اپنے اس دور کے بارے میں وہ شاید کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ " میں ان دنوں اپنے ہر قول کو قول فیصل سمجھتا تھا۔ میرے اندر شدید ترین ادعائیت اور اذعائیت پائی جاتی تھی۔ "(32) اسی لیے ان کی شاعری میں حمد، نعت، سلام، مرثیہ اور دیگر مذہبی شاعری کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کے حمدیہ اور صوفیانہ کلام کی ایک ایک مثال ملاحظہ ہو

فرقت میں وصلت برپا ہے اللہ ہو کے باڑے میں

آشوب وحدت برپا ہے اللہ ہو کے باڑے میں (33)

مندر یا مسجد یا دیر، سب کا بھلا ہو سب کی خیر

ہے یہ انسانوں کی سیر، سب کا بھلا ہو سب کی خیر (34)

وہ تہذیبی طور پر شیعہ ثقافتی روایت سے عمر بھر جڑے رہے۔ اس لیے ان کے ہاں سلام، مرثیہ، منقبت اور دیگر مذہبی شاعری مل جاتی ہے۔ حضرت امام حسینؑ سے اظہار عقیدت ملاحظہ ہو

خدا نہیں ہے تو کیا حق کو چھوڑ دیں اے شیخ!

غضب خدا کا ہم اپنے امام کے نہ رہیں (35)

مسلمانوں میں چیزوں کو ذاتِ اکبر کے نام سے شروع کرنے کی روایت ہے۔ جون ایلیا نے 1958ء میں جب انشا کے لیے انشائیے لکھنے شروع کیے تو پہلا انشائیہ اس حوالے سے دل چسپی سے خالی نہیں ہے

"زندگی میں کہیں ٹھہراؤ اور رکاؤ نہیں پایا جاتا۔ ایک قوت ہے جو ابل رہی ہے۔ ایک رو ہے جو بہہ رہی ہے اور ایک طوفان ہے جو امڈ رہا ہے۔ انسانی زندگی کے مظاہر کا عالم بھی یہی ہے۔ کیوں کہ حیاتِ بشر کے تمام مظاہر اور تمام شعائر خود اسی ذاتِ اکبر کے رنگارنگ پہلو ہیں جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔" (36)

شاہانہ رئیس چچا جون کے پیش لفظ میں جون ایلیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ میں نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کے مزار پر گئی مگر وہاں کوئی سکون نہیں ملا "جب تم دلی گئے تھے تو وہیں مزار پر پڑے رہتے تھے۔ نہ جانے تمہیں وہاں کیا خوشی ملی تھی؟ تم کراچی سے ٹھٹھہ اور وہاں سے دلی ہر مزار پر گھومتے رہے ہو۔۔۔" (37) جون ایلیا 1975ء میں ہندوستان گئے تھے۔ تب تک صوفیا کے ساتھ ان کا قلبی تعلق برقرار تھا۔

جون ایلیا علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں علمی مباحث جاری رہتے تھے۔ لیکن جون ایلیا کا یقین اپنی جگہ برقرار تھا۔ پھر آہستہ آہستہ گمان سرایت کرنے لگتا ہے۔ جب یقین کو ٹھیس پہنچتی ہے تو وہ اسے بچانے کی جستجو کرتے ہیں۔ لیکن یہ جستجو رائیگاں جاتی ہے۔ وہ اپنی یقینیات کو فلسفے کی روشنی میں تحقیق کرتے ہیں تو تشکیک کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ii۔ تشکیک

مکالماتی نظم رمز ہمیشہ ارتقائی مراحل طے کرتی اگلے مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔ روحانی سرشاری عقل انگیزہ کے آنے سے مضمحل ہو جاتی ہے۔ آبائی عقائد دھندلانے لگتے ہیں۔ یقین کی سرشاری دم توڑنے لگتی ہے۔ روح کا آسمان خون آلود ہو جاتا ہے۔ شاعر اور اس کے ہم زاد میں جنگ چھڑ جاتی ہے۔ نتیجتاً آگہی کا جہنم بھڑک اٹھتا ہے اور خوش ماجرا روز و شب بکھر جاتے ہیں۔ فیضِ توفیق کی رسد رکتے ہی لفظ معانی سے تہی ہو جاتے ہیں۔ یقین سے گمان کے سفر کا احوال بیان کرتے ہوئے جون ایلیا شاید کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ انہیں بارکلے کی تصوریت پسندی نے متاثر کیا۔(38) ڈیوڈ ہیوم کی کتاب "مبادی علم انسانی" پڑھی تو بقول ان کے "دینا کا تو پہلے بھی نہیں تھا یہ کتاب پڑھ کر دین سے بھی گیا" ۔(39) میں فلسفے کا مطالعہ کرنے کے نتیجے میں اپنی تمام تریقینیات سے محروم ہو گیا۔ اس کے بعد میری یہ کیفیت ہو گئی کہ ایک زاویہء قائم دو حادہ زاویوں کے برابر ہوتا ہے تو ہوا کرے، میری بلا سے۔ (40)

یقین کی رخصتی کوئی معمولی نقصان نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جا سکتا۔ شاعر کو درماندگی، اضمحلال، بیگانگی، بے چارگی اور تشکیک گھیر لیتی ہیں۔ اس کیفیت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں

"میرا سب سے بڑا مسئلہ یقین سے محروم ہونے کی اذیت سے تعلق رکھتا تھا۔ ارتیابیت میرے نزدیک ہرگز کوئی خوش آئند کیفیت نہیں تھی۔ لیکن والٹیر کے قول کے مطابق یقین انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ (41)

تھوڑا آگے جا کر لکھتے ہیں

" مادے، روح اور ذہن کی اس تباہی کے بعد ایک جاں کاہ ارتیابیت میں مبتلا ہو گیا۔ میری اذاعیت اور اداعیت بدترین انجام سے دوچار ہوئی تھی"۔ (42)

شک ان کے جسم و جان میں سرایت کر جاتا ہے۔ وہ تشکیک کو منزل سمجھ کر مجسم گمان بن جاتے ہیں۔ انہیں ہر چیز کے وجود پر شک گزرتا ہے۔ حتی کہ خواب میں بھی ان کو چیزوں کو خواب ہی سمجھتے ہیں۔

تمہارے رنگ مہکتے ہیں خواب میں جب بھی

تو ان کو خواب میں بھی خواب ہی سمجھتے ہیں (43)

شاید کے دیباچے سے پتا چلتا ہے کہ ان کے بڑے بھائیوں سید محمد تقی اور سید محمد عباس کا جھکاؤ سوشلزم اور کمیونزم کی جانب تھا۔ ان کے زیر اثر وہ بھی ان نظریات سے متاثر ہوتے ہیں۔ جن میں ادعائیت سے دوری نمایاں تھی۔

گمان کے سفر کا پڑاؤ کافی طول کھینچتا ہے۔ ایک دور میں وہ گمان کو ہی منزل سمجھ بیٹھے تھے۔

وہ میرا اک گمان کہ منزل تھا جس کا نام
ساری متاعِ شوقِ سفر اس میں گم ہوئی (44)

عمریں گزر گئی تھیں ہم کو یقیں سے بچھڑے
وہ لمحہ اک گماں کا صدیوں سے بے اماں تھا (45)

جون کی شاعری کا غالب عنصر گمان یا تشکیک ہے۔ اسی لیے ان کے شعری مجموعوں کے نام شاید، یعنی اور اسی پیٹرن پر رکھے گئے دیگر شعری مجموعوں کے نام لیکن، گویا، ممکن، گمان ان کی متشکک شخصیت کے عکاس ہیں۔ جون ایلیا کے بارے میں لکھی گئی تحریروں کا مجموعہ ' میں یا میں ' بھی اسی حقیقت کا عکاس ہے۔ پہلے مجموعہ کلام شاید کی پہلی نظم کے پہلے دو مصرعوں میں لفظ شاید تین مرتبہ آیا ہے

میں شاید تم کو یکسر بھولنے والا ہوں
شاید جانِ جاں شاید (46)

جون ایلیا کے کلام میں تشکیک اور گمان کے موضوع پر کچھ منتخب اشعار

زمیں تو کچھ بھی نہیں ، آسماں تو کچھ بھی نہیں
اگر گماں نہ ہو، درمیاں تو کچھ بھی نہیں (47)

دل کی ہر بات دھیان میں گزری

ساری ہستی گمان میں گزری (48)

ایک گماں کا حال ہے اور فقط گماں میں ہے
کس نے عذابِ جاں سہا، کون عذابِ جاں میں ہے (49)

جز گماں اور تھا ہی کیا میرا
دل گماں تھا گمانیاں تھے ہم (50)

ہر آن آخری ہے مگر اس کے باوجود
اس آن بھی یقینِ فنا چاہیے ہمیں (51)

پڑھ رہا ہوں میں کاغذاتِ وجود
سارا دفتر گماں کا دفتر ہے (52)

جون اپنے کرب سے نجات کی بجائے اس میں رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن کہیں مستقل قیام ان کے مزاج کے خلاف ہے۔ان کی بے قرار روح اور متجسس ذہن انہیں کہیں کا نہیں رکھتا۔یقین کے ساتھ ساتھ انہیں گمان بھی فریب دکھائی دیتا ہے۔وہ گمان سے بھی گزر جاتے ہیں اور یقین اور گمان دونوں کو الوادع کہہ دیتے ہیں۔

یہ جو بھی کچھ ہے نہیں کچھ بھی جُز فریبائی
یقیں کو چھوڑ دو یعنی گماں سے چل نکلو (53)

iii۔ لاادریت

مظاہر کے وجود کے متعلق فکر کا یقین و گمان کے بیچ معلق ہونا، ہے یا نہیں ہے کی حالت لاادریت کہلاتی ہے۔ (54)ڈاکٹر عبدالسلام کے مطابق "ہم خدا یا کسی غیر مادی شے کا کچھ علم نہیں رکھتے۔نہ آئندہ ہو

سکتا ہے"۔ (55) وہ مزید لکھتے ہیں کہ "لاادری جب کہتا ہے کہ وہ فطرت کی حدود سے باہر حقیقت کو جاننے سے معذور ہے تو وہ حقیقت کو تسلیم کرتا ہے"۔ (56)

شبنم رومانی نے اپنے ایک مضمون میں جون ایلیا کی تصورِ خدا کے بارے میں تشکیک کے ضمن میں پیشن گوئی کی تھی کہ "تیقن کو جانے والا رستہ تشکیک سے لازماً گزرتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جون اس راستے سے گزر کر اپنی منزل تک ضرور پہنچے گا۔" (57)

لیکن ان کی یہ پیشن گوئی درست ثابت نہیں ہوئی۔ کیوں کہ جون ایلیا کے ہاں تشکیک کسی وقتی ابال کا نتیجہ نہیں تھی۔ نہ ہی کسی سے متاثر ہو کر وہ اس طرف آئے تھے۔ اس کی تہہ میں شعوری کرب تھا۔ وہ کشتیاں جلا کر تشکیک میں داخل ہوئے تھے۔ اس لیے یقین کی طرف لوٹنے کی بجائے وہ تشکیک کے اگلے مرحلے میں پہنچ گئے۔ وہ اپنے بارے میں شاید کے دیباچے میں لکھتے ہیں "میں ایک متشکک اور لاادری آدمی ہوں۔ مجھے اب اپنی کسی بات پر کوئی اصرار نہیں"۔ (58) اپنے ایک انٹرویو میں بھی وہ لاادری ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ "میرے حقیر اور بے حد ناکافی مطالعے نے اب مجھے لاادریت تک پہنچایا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ جون ایلیا کچھ بھی نہیں جانتا۔ کچھ بھی تو نہیں جانتا"۔ (59) اس لیے اب وہ چپ رہنے پر اصرار کرتا ہے۔

کیا یقین اور کیا گماں چپ رہ
شام کا وقت ہے میاں چپ رہ (60)

لاادریت اردو شاعری میں عام ہے۔ شعرا ماورائیت کے قائل ہونے کے باوجود کسی وقتی کیفیت کے تحت حیرت، تذبذب یا خاموشی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جون ایلیا کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔

اب میں نہیں رہا ہوں کسی بھی گمان کا
اے میرے کفر ! اے میرے ایمان ! الوداع (61)

یقین کے بعد گمان کی رخصتی بھی جون ایلیا کے لیے تکلیف دہ رہی۔ گمان کی بے لباسی انہیں بے اماں کر گئی۔

بخشش ہوا یقین گماں بے لباس ہے

اک آگ جامہ زیب، دھواں بے لباس ہے (62)

جون ایلیا کے ہاں مختلف فکری جہات پر نمائندہ اشعار کی تعداد دیکھ کر دھیان نصیر ترابی کی اس رائے کی طرف جاتا ہے کہ وہ معتبر شاعر تھے۔(63) لاادریت پر ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

میں ہوں بھی یا نہیں ہوں عجب ہے مرا حساب

ہر لمحہ یا کے ساتھ ہوں، تم کس کے ساتھ ہو؟ (64)

جون ایلیا پر لکھے گئے مضامین کے انتخاب ''میں یا میں'' کے آغاز میں درج شعر بھی ہونے یا نہ ہونے سے متعلق ہے۔ لیکن یہ شعر ان کے کسی مجموعہ کلام میں نہیں ہے۔

قہر ہے ذات کا یہ مضموں بھی

یعنی میں جو ہوں جون، میں ہوں بھی؟ (65)

جون ایلیا کی لاادریت کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ''میں اپنی شدید ارتیابیت کے باوجود یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کرۂ ارض بلکہ ہماری اس کہکشاں کے کسی بھی سیارے پر کسی ایسے دماغ کا وجود فرض کرنا ممکن نہیں جو لفظ خدا کے مفہوم کی تشریح کر سکے''۔ (66)

iv۔ الحاد

تعقل کے نتیجے میں جون ایلیا کی تشکیک الحاد میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے کے بارے میں اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں

> ''سعد و مسعود ایمان ہو یا منحوس الحاد، یہ دونوں ہی یقین کا عطیہ ہیں۔ میں ان دونوں عطیوں سے بہرہ اندوز ہوا ہوں۔ یقین وہ سب سے بڑی دولت ہے جو نوع انسانی کے کسی فرد کو نصیب ہو سکتی ہے۔ فلسفہ پڑھنے سے پہلے میرا ذہن بھی ایمان کی صورت میں یقین کی بخشی ہوئی حالت استراحت سے بہرہ مند تھا۔ پھر فلسفے کی تعلیم

اور مطالعے کے ایک خاص دور سے میرا ذہن ایمان کے بجائے الحاد کی عطا کردہ
حالتِ استراحت سے بہرمند ہوا۔" (67)

جون ایلیا کا ارتیابیت سے لاادریت اور زندیقیت کے سفر کا آغاز گھر سے ہوتا تھا۔ شاید کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ والد کی جنت اور جہنم کی پینٹنگ جس میں انہوں نے رنگوں کی شدت سے ان کے طبقات کو ممیز کیا تھا، کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ دو بعدی جہنم ان کے لاادری اور زندیق بیٹے جون ایلیا کے حق میں سہ بعدی ہو گیا۔(68) حالت یہ ہو گئی کہ "1986ء کا ذکر ہے کہ میری حالت گزشتہ دس برس سے سخت ابتر تھی۔ میں ایک نیم تاریک کمرے کے ایک گوشے میں سہما بیٹھا رہتا تھا۔ مجھے روشنی، آوازوں اور لوگوں سے ڈر لگتا تھا۔" (69)

شکست یقین جہاں ان کے لیے اذیت ناک تھی وہیں وہ اس سے لطف اندوز بھی ہوتے رہے۔ مسلمات کے قلعوں کو توڑنا ان کی فطرت تھی۔ حتیٰ کہ اپنا آپ بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ وہ ماروائے وجود اور بعد الطبیعاتی حقائق پر یقین نہیں رکھتے۔۔۔ ایک نوع کی لاادریت اور بے یقینی ان کی تخلیقی زندگی اور فکری فضا کا حصہ بن چکی تھی۔ جسے ان کی نفسیاتی کیفیات یا سائیکی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔(70)

ان کے مجموعہ کلام "لیکن" کی پہلی نظم مقولہء عنکبوت وہ موجود اور لا موجود پر فلسفیانہ انداز میں بات کرتے ہوئے تشکیک الحاد میں یوں داخل ہوتی ہے۔

میں پیاپے جو موجود ہوں
صرف موجود ہوں
صرف موجود ہونے کی حالت میں ہونے کا حوصلہ چاہیے
وہ خدایانِ خدا میں بھی شاید نہ ہو
عنکبوتِ رواقِ کہن کا مرے یہ مقولہ ہے:
ہے بھی نہیں
اور تھا بھی نہیں (71)

جون علم پر عقیدے کی اجارہ داری کے انکاری تھے۔ سیاسی اور مذہبی اشرافیہ پر طنز دیکھیں۔

نسبتِ علم ہے بہت حاکمِ وقت کو عزیز
اس نے تو کارِ جہل بھی بے علما نہیں کیا
جس کو بھی شیخ و شاہ نے، حکمِ خدا دیا قرار
ہم نے نہیں کیا وہ کام، ہاں! بخدا نہیں کیا! (72)

لیکن جون ایلیا حالتِ الحاد میں زیادہ دیر نہ رہ سکے۔ تشکیک ان کا مستقل مسئلہ رہی۔ ایک انٹرویو میں وہ بتاتے ہیں

"ایمان اور الحاد ذہن کی خوشگوار ترین حالتیں ہیں۔ مگر میں ان سے زیادہ دیر تک بہرہ مند نہ رہ سکا اور آخر کار میرا ذہن اس عذاب الیم میں مبتلا ہوا جسے تشکیک کہتے ہیں۔ جو انسان شک پسند ہو وہ ہر لمحہ ایک ذہنی جہنم میں جلتا رہتا ہے۔ میں نے اپنی جوانی کے کئی سال، کئی جاں پرور ترین سال اپنے ذہن کی اس عذاب ناک حالت میں گزارے ہیں۔۔۔ پہلے شروع میں، میں مذہبی تھا لیکن اپنے فلسفے کے مطالعے کے نتیجے میں اور ان مجلسوں کے منطقی حصے کے زیر اثر میں وقتی طور پر ملحد ہو گیا تھا۔ البتہ اب تمہارے سامنے ہوں، گویا۔۔۔" (73)

v۔ انکار

انکار کا مضمون جون ایلیا کے ہاں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ انکار صرف خدا کی ذات کا نہیں بلکہ یہ ایک ہمہ جہت انکار ہے۔ وہ خود اپنے ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ اس باغیانہ رویے کا آغاز یوں ہوتا ہے

"میرے سنجھلے بھائی سید محمد عباس بم بنانے کی ترکیب تلاش کرتے رہتے تھے تاکہ سرکاری عمارتوں کو اڑا سکیں۔ وہ مجھے ہندوستانی انقلابیوں کے قصے سنایا کرتے تھے۔ مجھے انگریز سامراج سے نفرت دلانے میں انہوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔" (74)

بچپن کے یہ اثرات ان کے مزاج کا حصہ بن گئے۔ عمر بھر انکار ان کا ایک مستقل موضوع رہا۔ جو ان کی ذات سے شروع ہو کر رشتوں، قدروں، روایت، سسٹم اور خدا کے انکار تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کے ایک مسلسل غزل کے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

وفا ، اخلاص ، قربانی ، مروّت
اب ان لفظوں کا پیچھا کیوں کریں ہم
اُٹھا کر کیوں نہ پھینکیں ساری چیزیں
فقط کمروں میں ٹہلا کیوں کریں ہم
نہیں دُنیا کو جب پرواہ ہماری
تو پھر دُنیا کی پرواہ کیوں کریں ہم
ہیں باشندے اسی بستی کے ہم بھی
سو خود پر بھی بھروسہ کیوں کریں ہم
چبا لیں کیوں نہ خود ہی اپنا ڈھانچا
تمھیں راتب مہیا کیوں کریں ہم
پڑی رہنے دو انسانوں کی لاشیں
زمیں کا بوجھ ہلکا کیوں کریں ہم
یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی
یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم (75)

انکار کی ایسی سینکڑوں مثالیں ان کے کلام میں موجود ہیں۔ جن کے باعث انہیں نراجی، روایت شکن اور باغی کہا جاتا ہے۔

جون ایلیا کے تعقل کے سفر نامہ کے ضمن میں یقین، گمان، لاادریت، الحاد اور انکار کے عنوانات کے تحت جس ارتقا کو بیان کیا گیا وہ مقالے کی ضرورت ہے ۔ ان کی زندگی میں کسی قسم کی ترتیب تلاش کرنا ممکن نہیں۔ ایک ہی وقت میں متضاد اور مختلف کیفیات کی یکجائی بظاہر ممکن دکھائی نہیں دیتی، کیوں کہ یقین اور

انکار دو انتہائیں ہیں۔ عموماً یقین مصلحت اور مفاہمت کے رجحان کو جنم دیتا ہے اور بغاوت کے لیے غیر یقینی شرط اوّلین ہے۔ جون ایلیا کی شخصیت میں تضادات کی یکجائی ہے۔ ان کی شاعری میں ایمان سے انکار تک کے مختلف شیڈز بتاتے ہیں کہ جون ایلیا ایک تغیر پذیر شخصیت تھے۔ وہ مسلسل اضطراب تھے۔ کسی ایک حالت میں رہنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ لیکن مجموعی طور پر ان کی فکر پر تشکیک کا رنگ غالب ہے جو اکثر و بیشتر انکار اور بغاوت پر منتج ہوتا ہے۔ جسے مابعد جدید صورت حال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ج) جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک کی صورتیں:

i۔ وجودِ خدا پر تشکیک

فلسفے سے دلچسپی کے باعث موجود اور لا موجود کے مباحث جون ایلیا کے ہاں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ شاید کے دیباچے نیاز مندانہ میں لکھتے ہیں

> " دنیا کے کسی فلسفے نے میرے علم کے مطابق آج تک وجود اور موجود کی تعریف کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ ہم لغوی اور نصابی طور پر وجود کی ایک ہی تعریف کر سکتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وجود کا ایک ہی مترادف بیان کر سکتے ہیں اور وہ ہے ماہیت کا خارج میں ہونا۔ میں اپنے فلسفیانہ مطالعے، یقیناً بے حد محدود مطالعے کی پیش نظر کہہ سکتا ہو کہ وجود کی اس کے سوا آج تک کوئی توضیح نہیں کی جا سکی۔ جب ہم یہ کہتے کہ خدا موجود ہے تو ہم اسے ایک ماہیت قرار دیتے ہیں۔ ہم گفتگو آگے بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر موجود شے ہے اور ہر شے موجود ہے۔ شیئیت اور وجود ہم معنی ہیں۔ اگر ہم کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا شے ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ خدا لاشے ہے۔ لاشے کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ موجود جو شے نہ ہو، کچھ اور ہو۔ کچھ اور کیا؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب مابعد الطبیعی فکر کے نمائندوں کو دینا ہے۔ "(76)

لیکن اس یقین کی رمق ان میں اخیر عمر تک رہتی ہے۔ ان کا تصورِ خدا بھی ابہام کا شکار ہے۔ روح پر درجنوں اشعار مل جاتے ہیں۔ قسمت کی شکایت جگہ جگہ موجود ہے۔

میں کیوں بھلا قضا و قدر سے برا بنوں
ہے جو بھی انتظام خدایا درست ہے (77)

اے خدا جو کہیں نہیں موجود
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں (78)

ہم نے خدا کا رد لکھا، نفی بہ نفی لا بہ لا
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے (79)

تجھ سے بڑھ کر وہم ہے تیرا خدا
ہشت اے انسان ، اے انسان، ہشت

بت ہے کہ خدا ہے وہ، مانا ہے نہ مانوں گا
اس شوخ سے جب تک میں خود مل نہیں آنے کا (81)

جو کہیں بھی نہ ہو، کبھی بھی نہ ہو
آپ اُس کو خدا سمجھ لیجئے (82)

کہتے ہیں جس کو ذات وہ گویا کہیں نہیں
دنیا میں دیکھ آئے، یہ در وا کہیں نہیں (83)

ہے خدا ہی پہ منحصر ہر بات
اور آفت یہ ہے، خدا بھی نہیں (84)

ہم کو ہرگز نہیں خدا منظور
یعنی ہم بے طرح خدا کے ہیں (85)

منکرانِ خدائے بخشندہ!
اس سے تم اور اک خدا مانگو (86)

اپنا رشتہ زمیں سے ہی رکھو
کچھ نہیں آسمان میں رکھا (87)

یُوں جو تکتا ہے آسمان کو تُو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا؟ (88)

کچھ لوگ جون کی اس طرح کی شاعری کو تنزیہہ کے ذیل میں لاتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر خالد بلغاری اپنے مضمون جون ایلیا کے فکری اغوا میں لکھتے ہیں

"وہ کانٹ کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مابعد الطبیعیاتی حقائق علت و معلول اور مقولات کی پابند عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ جبکہ اسلامی صوفی روایت کے بہت توانا جزو کی پیروی میں ذات باری کے بارے میں تنزیہی مقام پر فروکش نظر آتے ہیں۔" (89)

لیکن جون کی شخصیت اور کلام کے عمیق مطالعے سے ان اشعار کو تنزیہہ کے ذیل میں نہیں لایا جا سکتا۔ ان کے الحادی افکار سے قطع نظر انہوں نے خدا کی ہستی اور اس کی تخلیقات پر سنجیدہ سوالات اٹھائے ہیں۔ انہوں نے جس طرح دیگر معاملات میں جو ان کا اسلوب تھا اسی میں خدا کے بارے میں بھی سوالات کا ایک سلسلہ ہے۔ جس میں بھرپور طنز اور تمسخر موجود ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو

حاصل کن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

پھر بنایا خدا نے آدم کو
اپنی صورت پہ ایسی صورت میں(90)

جون ایلیا کے کلام کا بڑا حصہ اسی موضوع سے متعلق ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو

ہم یہاں خود آئے ہیں لایا نہیں کوئی ہمیں
اور خدا کا ہم نے اپنے نام پر رکھا ہے نام (91)

یہ نظم بھی اسی سلسلہء فکر کی کڑی ہے:

کہاں کا دین، کیسا دین، کیا دین
یہ کیا گڑ بڑ مچائی جا رہی ہے
شعورِ آدمی کی سر زمیں تک
خدا کی اب دُہائی جا رہی ہے
مجھے اب ہوش آتا جا رہا ہے
خدا تیری خدائی جا رہی ہے (92)

جون ایلیا نے ادّعاعیت (dogmatism) پر طنز کے نشتر چلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اور یہ کلام ان کے پاکستان آنے یعنی 1957ء سے پہلے کا ہے۔

رکھو دیر و حرم کو اب مقفّل
کئی پاگل یہاں سے بھاگ نکلے
وہ گنگا جل ہو یا آبِ زمزم
یہ وہ پانی ہیں جن سے آگ نکلے (93)

جون اسلامیوں سے بحث نہ کر
تند ہیں یہ ثمود و عاد بہت (94)

ii۔ انسانی تعلقات پر تشکیک

تشکیک علم اور تحقیق کے میدان میں حیات بخش سہی لیکن سماجی تعلقات میں اس کی کچھ مریضانہ شکلیں بھی سامنے آتی ہیں۔ اگر آپسی تعلقات میں تشکیک میں احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو اعتبار کی عمارت چٹخ جاتی ہے۔ یہی سب جون ایلیا کے ساتھ ہوا۔ بے یقینی اور تشکیک جون ایلیا کا مزاج بن گیا تھا۔ عنبریں حسیب عنبر اپنے مضمون جون ایلیا اور زندگی کی معنویت میں لکھتی ہیں

> "بے یقینی جون کا بنیادی مسئلہ ہے۔ جو ان کے ہاں کبھی انسانی وجود کی بے معنویت تسلیم کر لینے سے، کبھی زندگی کے مسائل سے، کبھی حالات کے تغیر سے، اور کبھی خود اپنے احساس کی کیفیات کے تغیر سے پیدا ہوتا ہے۔" (95)

پروفیسر سحر انصاری کے زاہدہ حنا سے شادی کے حوالے سے جون کی تشکیک کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں

> " بھائی جون کے مزاج میں وہی تذبذب، بے یقینی اور تشکیک جاگزیں تھی جو آخر دم تک ان کے ساتھ رہی۔ چناچہ زاہدہ حنا کے بارے میں کبھی کوئی رائے دیتے، کبھی کچھ اور۔۔۔ دونوں کی شادی تو ہو گئی لیکن تشکیک کی نذر ہو گئی۔" (96)

شاہانہ رئیس ایلیا لکھتی ہیں کہ "جون ایلیا پور پور محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن اس پھوہڑ پن سے کہ اپنے مخلص اور قریب ترین لوگوں کو بھی ناراض کر دیتے ہیں۔ ان کی ذات سے یہ توقع ناممکن ہے کہ ان کی زبان لوگوں کے کان میں پیار کا امرت ٹپکا سکے"۔ (97)

جون ایلیا اپنے رقیب کے بارے میں اتنی گہری تشکیک کا شکار ہوئے اور اپنی محبوبہ کو قتل کرنے پر تل گئے

> " میں نے ایک دن سوچا کہ میرا رقیب پریا کے جسمانی وجود سے محبت کرتا ہے اگر جسمانی وجود ہی باقی نہ رہے تو میرے رقیب کا معاملہ ختم ہو جائے گا۔۔۔ کیوں کہ وہ ذہنی وجود سے محبت کرنے کی قطعاً صلاحیت نہیں رکھتا۔" (98)

یہ مضمون ان کی شاعری میں جابجا بکھرا نظر آتا ہے۔

کیا تکلف کریں یہ کہنے میں
جو بھی خوش ہے ہم اس سے جلتے ہیں (99)

بہت نزدیک آتی جا رہی ہو
بچھڑنے کا ارادہ کر لیا کیا؟ (100)

تم کون ہو یہ خود بھی نہیں جانتی ہو تم
میں کون ہوں یہ خود بھی نہیں جانتا ہوں میں (101)

اور اس سخن میں وہ یوں ڈھلے کہ جیسا باغیانہ رویہ انھوں نے دنیا سے اپنایا تھا وہ محبوب سے بھی اختیار کر لیا:

مل رہی ہو بڑے تپاک کے ساتھ
مجھ کو یکسر بھلا چکی ہو کیا؟ (102)

قطع نظر اس کے کہ تعلقات میں خرابی خود تعلق داروں کا ہاتھ بھی تھا یا نہیں، یہ حقیقت ہے کہ جون ایلیا مصلحت پسندی کے قائل نہیں تھے۔ ان کے دوست رضی مجتبی جون ایلیا پر اپنے مضمون جون سوختہ جاں میں لکھتے ہیں

"جون جیسا انا پرست عالمِ فوضویت کا شکار ہو سکتا ہے مگر مصلحت کا نہیں۔ جون نے جس کا انکار کیا اس کے حصار سے نہیں نکل پائے۔ چاہے وہ شخصی سطح پر ہو یا ماورائی سطح پر۔" (103)

وہ خود بھی اپنے بارے میں کہتے ہیں۔

ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے
جس سے ملیے اسے خفا کیجے
ہے تقاضا مری طبیعت کا

ہر کسی کو چراغ پا کیجے (104)

جون ایلیا کی شاعری میں انسانی تعلقات پر تشکیک کے کچھ نمائندہ اشعار پیش ہیں۔

کیا کہا عشق جاودانی ہے؟

آخری بار مل رہی ہو کیا؟ (105)

طنز پیرائیہ تبسم میں

اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ (106)

مجھ کو تو کوئی ٹوکتا بھی نہیں

یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا؟ (107)

اب جو رشتوں میں بندھا ہوں تو کھلا ہے مجھ پر

کب پرند اڑ نہیں پاتے ہیں پروں کے ہوتے (108)

سب میرے بغیر مطمئن ہیں

میں سب کے بغیر جی رہا ہوں (109)

کیا تکلف کریں یہ کہنے میں

جو بھی خوش ہے ہم اس سے جلتے ہیں (110)

مختصراً عام گفتگو میں لفظ تشکیک گمان اور شک کا مترادف ہے۔ لیکن فلسفیانہ معنوں میں تشکیک سے مراد رائج الوقت فلسفوں اور اقدار کو شک کی نگاہ سے دیکھنا ہے۔ تشکیک کی صوفیانہ، فلسفیانہ اور شاعرانہ روایتیں موجود ہیں۔ جون ایلیا کے تعقل کا سفر یقین سے شروع ہو کر تشکیک، لاادریت اور الحاد سے ہوتا ہوا انکار تک آتا ہے۔ کسی بھی جگہ ان کا مستقل پڑاؤ نہیں ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ان پر تشکیک کا غلبہ ہے۔ ان کی نظم رمز ہمیشہ میں اس تمام سفر کا احوال بیان ہوا ہے۔ اس سفر کے پہلے مرحلے میں وہ کامل یقین کے نوری

حصار میں لپٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک الوہی سرشاری ہر وقت ان پر طاری رہتی تھی۔ تب کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اگر پیدا ہو بھی جاتا تو خود بخود اس کا جواب مل جاتا۔ کوئی چیز بے معنی نہیں تھی۔ ہر چیز روح کی توسیع تھی۔ معجزے معمول تھے۔ اس دور کے اثرات ان کے کلام میں حمد، نعت، سلام اور صوفیانہ کلام کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر نہیں رہتی۔ اپنی فلسفیانہ طبیعت کے باعث وہ تشکیک کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر شدید کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ جس سے یقین کی سرمستی جاتی رہتی ہے۔ پہلے ہر چیز بامعنی تھی لیکن تشکیک کے نتیجے میں لفظ معنی سے تہی ہونے لگتے ہیں۔ شک ان کے وجود میں زہر کی طرح سرایت کر جاتا ہے۔ اور وہ اسی کو منزل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا زیادہ تر حصہ گمان کے بارے میں ہے۔ لیکن پھر گمان بھی رخصت ہو جاتا ہے۔ وہ یقین کی طرف لوٹنے کی بجائے لاادریت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یقین اور گمان دونوں کو وہ الوداع کہہ دیتے ہیں اور چیزوں پر اصرار چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن لاادریت کا یہ مرحلہ بھی زیادہ عرصہ نہیں چلتا۔ ان کا تشکیکی ذہن اسے بھی رد کر دیتا ہے اور وہ ملحد بن جاتے ہیں۔ تشکیک ان کی حیات کے ہر مرحلے میں ان کے ساتھ رہتی ہے۔ اس لیے وہ کسی مقام پر ٹھہر نہیں سکے۔ خدا، اقدار، نظام، یہاں تک کہ وہ اپنے ہونے کے بھی انکاری تھے۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری میں تشکیک کا رنگ غالب ہے۔

حوالہ جات

1۔ سید تصدق حسین رضوی، مولوی، لغتِ کشوری، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، بھارت، طبع بیست، 1959ء، ص 10

2۔ شیخ منہاج الدین، پروفیسر، قاموس الاصطلاحات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، طبع دوم، 1982ء، ص 30

3۔ سلیم شہزاد، فرہنگ ادبیات، آشوبِ آگہی، منظر نما، مالیگاؤں، مہاراشٹر، انڈیا، ص 243

4۔ فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ، جلد دوم، مرتبہ جمیل جالبی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول 1993ء، ص 394

5۔ کلیم الدین احمد، فرہنگ ادبی اصطلاحات، ترقی اردو بیورو، دہلی، انڈیا، 1986ء، ص 7

6۔ وحید عشرت، ڈاکٹر، مترجم، تجدیدِ فکریاتِ اسلام، علم اور مذہبی مشاہدہ، علامہ اقبال اکیڈمی، لاہور، 2002، ص 150

7۔ عمر خیام، مجموعہ رباعیات عمر خیام، منشی نول کشور، لکھنؤ، 1969ء، ص 11

8۔ حقانی القاسمی، غزل میں کفر و الحاد کا تصور، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، http://ncpulblog.blogspot.com/، 22 جولائی 2020ء 3:30pm

9۔ نقد اقبال، میکش اکبر آبادی، مکتبہ جامع، دہلی، انڈیا، طبع سوم، 1982ء، ص 24

10۔ میر دردؔ، خواجہ، دیوان درد، مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، مکتبہ جامع، نئی دہلی، 1963ء، ص 81

11۔ ایضاً، ص 121

12۔ ظفر سپل، ورثۂ دانشِ یونان، بک ہوم، کراچی، 2013ء، ص 54

13۔ سلام سندھیلوی، ڈاکٹر، اردو شاعری میں لاادریت، ادبی مرکز، گورکھپور، 1988ء، ص 39

14۔ عبد الماجد دریابادی، مولانا، تشکیک سے مذہب کی تائید ہوتی ہے یا مخالفت، رسالہ معارف، جلد اول، شمارہ چہارم، اکتوبر 1916ء، ص 23

15۔ الطاف حسین حالیؔ، مسدس حالی، حالی پبلشنگ، دہلی، 1935ء، ص 201

16۔ میر تقی میرؔ، دیوان اول، مشمولہ: مزامیر یعنی انتخاب کلام میرؔ، اثر لکھنوی، کتابی دنیا، دہلی، 1947، ص40

17۔ شاد عظیم آبادی، میخانہ الہام، برقی مشین، پٹنہ، سن ندارد، ص182

18۔ مرزا غالب، دیوانِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، شیخ غلام علی، لاہور، 1967ء، ص213

19۔ ایضاً، ص 135

20۔ ایضاً، ص 198

21۔ علامہ محمد اقبالؔ، پیام مشرق، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، طبع دہم، 1963ء، ص132

22۔ ن م راشدؔ، کلیات راشد، کتابی دنیا، دہلی، 2011ء، ص96

23۔ جوشؔ ملیح آبادی، عرش و فرش، کتب خانہ تاج آفس، بمبئی، بھارت، 1944ء، ص42

24۔ فیض احمد فیض، (نظم) موضوعِ سخن، نسخہ ہائے وفا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1999ء، ص89

25۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، مکتبہء کارواں، لاہور، س ن، ص329

26۔ احمد فرازؔ، اے عشق جنوں پیشہ، لاہور، دوست پبلی کیشنز، 2010ء، ص163

27۔ شبلی نعمانی، شعر العجم اول، ص249

28۔ ظہیر رحمتی، غزل کی تنقید کی اصطلاحات، ظہیر رحمتی، دہلی، بھارت، 2005ء، ص385

29۔ سلیم شہزاد، فرہنگ ادبیات، آشوبِ آگہی، منظر نما، مالیگاؤں، مہاراشٹر، انڈیا، ص7

30 جون ایلیا، شاید، ص217

31۔ جون ایلیا، شاید، ص89

32۔ جون ایلیا، شاید، ص27

33۔ جون ایلیا، گمان، ص09

34۔ جون ایلیا، گویا، ص17

35۔ جون ایلیا، شاید، ص143

36۔ جون ایلیا، فرنود، مؤلف، خالد احمد انصاری، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2012ء، ص96

37۔ شاہانہ رئیس ایلیا، چچا جون، 2017ء، ص13

38۔ جون ایلیا، شاید، ص26

39۔ ایضاً، ص26

40۔ ایضاً، ص31

41۔ ایضاً، ص27

42۔ ایضاً

43۔ ایضاً، ص79

44۔ ایضاً، ص151

45۔ ایضاً، ص134

46۔ ایضاً، ص41

47۔ جون ایلیا، یعنی، ص22

48۔ جون ایلیا، گویا، ص211

49۔ جون ایلیا، گمان، ص11

50۔ جون ایلیا، گماں، ص29

51۔ جون ایلیا، یعنی، ص50

52۔ جون ایلیا، لیکن، ص73

53۔ جون ایلیا، گمان، ص96

54۔ سلیم شہزاد، فرہنگ ادبیات، آشوبِ آگہی، منظر نما، مالیگاؤں، مہاراشٹر، انڈیا، ص243

55۔ سلام سندھیلوی، ڈاکٹر، اردو شاعری میں لاادریت، ادبی مرکز، گورکھپور، 1988ء، ص43

56۔ ایضاً، ص47

57۔ شبنم رومانی، شاعری، مضمون، مشمولہ: میں یامیں، ص419

58۔ جون ایلیا، شاید، ص 25

59۔ جون ایلیا، انٹرویو، نیاز الدین خان، مشمولہ: میں یامیں، ص772

60۔ جون ایلیا، گمان، ص10

61۔ ایضاً، ص117

62۔ ایضاً،، ص65

63۔ نصیر ترابی، شعریات، پیر اماؤنٹ پبلشنگ انٹر پرائزز، کراچی، 2013، ص6

64۔ جون ایلیا، لیکن، ص59

65۔ خالد احمد انصاری، میں یا میں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2020ء، ص6

66۔ جون ایلیا، شاید، ص28

67۔ جون ایلیا، سکوت لفظوں میں گنگنانا شاعری ہے (انٹرویو)، نیاز الدین خان، میں یا میں، ص772

68۔ جون ایلیا، شاید، ص16

69۔ جون ایلیا، شاید، ص12

70۔ عنبریں حسیب عنبر، جون ایلیا اور زندگی کی معنویت، مشمولہ خوش گزراں گزر گئے، نسیم سید، ص144

71۔ جون ایلیا، لیکن، ص15

72۔ جون ایلیا، شاید، ص223

73۔ جون ایلیا، سکوت لفظوں میں گنگنانا شاعری ہے (انٹرویو)، نیاز الدین خان، میں یا میں، ص774

74۔ جون ایلیا، شاید، ص17

75۔ ایضاً، ص125

76۔ جون ایلیا، لیکن، ص29

77۔ ایضاً، ص221

78۔ ایضاً، ص124

79۔ ایضاً، ص

79۔ جون ایلیا، شاید، ص197

80۔ جون ایلیا، یعنی، ص21

81۔ جون ایلیا، لیکن، ص195

82۔ ایضاً، ص213

83۔ جون ایلیا، گویا، ص85

84۔ ایضاً، ص92

85۔ جون ایلیا، گمان، ص66

86۔ ایضاً، ص33

87۔ جون ایلیا، گمان، ص15

88۔ جون ایلیا، شاید، ص216

89۔ خالد بلغاری، جون ایلیاء کا فکری اغوا، دانش، www. http://daanish.pk، 22 جولائی 2020ء، 02:12 pm

90۔ جون ایلیا، شاید، ص 24

91۔ جون ایلیا، گویا، ص133

92۔ جون ایلیا، گمان، ص37

93۔ جون ایلیا، شاید، ص287

94۔ جون ایلیا، لیکن، ص82

95۔ عنبریں حسیب عنبر اپنے مضمون جون ایلیا اور زندگی کی معنویت (145)

96۔ پروفیسر سحر انصاری کے زاہدہ حنا سے شادی (334)

97۔ شاہانہ رئیس، شاخ ویراں کا مغنی، (مضمون) مشمولہ: میں یا میں، ص413

98۔ جون ایلیا، سکوت لفظوں میں گنگنانا شاعری ہے (انٹرویو)، نیاز الدین خان، میں یا میں، ص769

99۔ جون ایلیا، یعنی، ص117

100۔ ایضاً، ص32

101۔ جون ایلیا، شاید، ص 70

102۔ ایضاً، ص 149

103۔ رضی مجتبی، جون سوختہ جاں، (مضمون): مشمولہ خوش گزراں گزر گئے، ص48

104۔ جون ایلیا، شاید، ص146

105۔ ایضاً، ص149

106۔ ایضاً، ص204

107۔ ایضاً، ص214

108۔ ایضاً، ص230

109۔ جون ایلیا، یعنی، ص81

باب چہارم

جون ایلیا کی شاعری میں مغائرت: تجزیاتی مطالعہ

۱) مغائرت کا مفہوم:

مُغَائَرَت یا مُغایَرَت کی اصطلاح اجنبیت، غیریت، بے گانگی، نا آشنائی، ناموافقت، دوری، تفریق اور فراق وغیرہ کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مطابق " مغایرت کے معنی غیریت، دوئی، اجنبیت، باہم غیر ہونا + مخالفت + جدائی + فراق۔" (1) فرہنگ ادبیات کے مطابق

> " کیفیت یا تصور جس میں فرد شناخت کے بحران کے سبب دوسرے افرد کے بیچ خود کو تنہا اور دوسروں سے جدا محسوس کرتا ہے۔ یہ کیفیت خاص مشینی عہد کی دین ہے۔ متعینہ افکار کے نظام اور مخصوص اصولوں کے جبر تلے اپنا بیگار نمٹا دینے والی مصروفیت فرد کو ہجوم میں تنہا کر دیتی ہے۔ ہجوم کا ہر فرد چونکہ ایک ہی نہج پر سوچ رہا ہوتا ہے اس لیے ہر فرد ہجوم میں خود کو تنہا خیال کرتا ہے۔" (2)

ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ میں اجنبیت کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

> " لاطینی alienus متعلق بہ دیگر سے مشتق ہے۔ لغوی سطح پر اس کے معنی برگشتگی، بے گانگی، اجنبیت، منتقلی ملکیت، روگردانی، انحراف اور علاحدگی وغیرہ کے ہیں۔ انگریزی میں بھی یہ لفظ اپنے لغوی اور اصطلاحی ہر دو اعتبار سے متعدد معانی کا حامل ہے۔ اسی بنیاد پر اس کے لیے اردو میں اجنبیت، علاحدگی، انقطاع، خرق، کشیدگی، غیر متعلق، بے تعلقی اور بے گانگی جیسے مترادفات کا استعمال سیاق کی مناسبتوں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ تبدیلی سیاق کے ساتھ ہی اس کے معنی کی نہج میں کبھی نمایاں اور کبھی انتہائی خفیف سی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اساساً اجنبیت ہی وہ لفظ ہے جو

متذکرہ بالا تمام الفاظ کے معنی کا احاطہ کر لیتا ہے۔ کیوں کہ ان تمام الفاظ کی تہہ میں
کسی نہ کسی طور پر اجنبیت کا تصور بھی کار فرما ہوتا ہے۔'' (3)

گویا مغائرت ایک ذہنی کیفیت ہے جو دلوں میں بُعد پیدا کرتی اور با معنی چیزوں کو بے معنی بنا دیتی ہے۔ یہ کسی فرد کو سماج اور اس کے معاملات سے ہی نہیں اس کی ذات سے بھی بیگانہ بنا دیتی ہے۔ جس سے شخصیت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

i۔ مغائرت کی وجوہات

ہیگل کا تصورِ بیگانگی

فلسفیانہ معنی میں بیگانگی کی اصطلاح نٹشے اور ہیگل نے انیسویں صدی کے ابتدا میں استعمال کی۔ ہیگل نے اجنبیت کے تصور کی عینی توضیح کی ہے۔ اس کے نزدیک روح کی اپنے آپ سے علاحدگی کا نام اجنبیت ہے۔ حقیقت کے ہر مظہر کی بنیاد اجنبیت ہے اور یہ جدلیاتی عمل ہی کی ایک حالت ہے۔ (4)

مارکس کا تصورِ بیگانگی

انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں مارکس نے بیگانگی کے سماجیاتی تناظر کا تصور پیش کیا جو ہیگل کے فلسفہ سے اخذ کیا گیا تھا لیکن ہیگل کا تصور جدلیات کی طرح اپنے بل پر کھڑا تھا۔ جب کہ مارکس نے اسے ذاتی کی بجائے سماجی پس منظر میں دیکھا۔ گویا بیگانگی کوئی ہمہ گیر اصول نہیں بلکہ سرمایہ دارنہ نظام کی عطا ہے۔ جس میں انسان کی بجائے پیداوار کو اہمیت دی جاتی ہے۔ محنت کش کو شے سمجھا جاتا ہے اور اسے تخلیقی مسرت کے جذبے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ معمولی اجرت اسے اس کی تخلیق سے لاتعلق کر دیتی ہے۔ پیداوار سے اس کی لاتعلقی اجنبیت کو جنم دیتی ہے اور یہ گمان عام ہو جاتا ہے کہ ہم ایک ایسے معاشرے میں زندہ ہیں جو انسانیت سے عاری ہے۔ محنت کش یہ محسوس کرتا ہے کہ صرف وہ ہی نہیں اس کے ساتھ کے تمام مزدور اپنی تخلیق سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ یہیں سے طبقات کا تصور جنم لیتا ہے۔ (5)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سماجی بیگانگی کی اصل وجہ سرمایہ دارانہ نظام ہے تو کیا اس نظام کی آمد سے پہلے سماج میں بیگانگی کا احساس نہیں تھا؟ کارل مارکس نے اس کا جواب اپنی کتاب کیپٹل داس کے پہلے

چیپٹر میں دیا ہے۔ جس کے مطابق چونکہ سرمایہ دارانہ نظام سے پہلے اشیاپرستی یا کموڈٹی فیٹشزم نہیں تھی اس لیے زیادہ پیداوار جاگیر دار کے ذاتی استعمال کے لئے پیدا ہوتی تھی۔ بقیہ پیداوار کموڈٹی کی صورت قریبی منڈیوں میں مزارع یا دستکار وغیرہ خود بیچتے تھے۔ اس لیے اس وقت اشیاپرستی یا کموڈٹی فیٹشزم کا تصور موجود نہیں تھا۔ (6)

وجودی تصورِ بیگانگی

وجودیت انسان کے اثبات کا فکری سفر ہے جو فردیت کو اجتماعیت کی بھینٹ چڑھانے کی مخالف ہے اور فطرت کے جبر کو تسخیر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ انسان شروع سے ہی یہ محسوس کرتا رہا ہے کہ اس پر جبر مسلط ہے۔ لیکن عالمگیر جنگوں میں انسان کی بے وقعتی کے رد عمل کے طور پر وجودی فکر ایک تحریک کی شکل میں ابھری۔ کسی نے وجود کو جوہر پر مقدم ٹھہرایا اور کسی نے خدا کی موت کا اعلان کیا۔ نتیجے کے طور پر معاشرے میں مایوسی، تنہائی اور بیگانگی نے جنم لیا۔ زندگی کی بے معنویت کو بڑی شدت سے محسوس کیا گیا جو مغائرت کی ایک بڑی وجہ ہے۔ وجودیت اس لغویت سے نکلنے کا حل یہ تجویز کرتی ہے کہ فرد اپنی ترقی کا تعین خود کرے۔ (7) سارتر کے بقول ہجوم فرد کو خود سے بیگانہ کر دیتا ہے۔۔۔ انسان اس کے علاوہ کچھ نہیں جو کچھ کہ اپنے آپ کو بناتا ہے۔ (8)

افتخار بیگ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے 'بیسویں صدی کی شاعری میں وجودیت کے اثرات' میں لکھتے ہیں:

> " فرد احساسِ جرم کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ وجود کی ہستی کی اتھاہ گہرائیوں سے پھوٹتا ہے۔ فرد کو بسا اوقات غیر معمولی صورتِ حال سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ صورتِ حال فرد کی محدودیت کا باعث بنتی ہے۔ محدودیت سدِ راہ بنتی ہے تو موجود کی خود آگہی اور خود تونگری کا احساس سوالیہ نشان کی زد میں آ جاتا ہے۔ یہی لمحہ بیگانگی کا ہوتا ہے۔" (9)

مابعد جدید تصورِ بیگانگی

کارل مارکس بیگانگی کا سرمایہ داری نظام کے تناظر میں مشاہدہ کرتا ہے۔ سارتر اسے بالادست قوتوں کی طرف سے روا رکھے جانے والے جبر کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ عینیت پسندوں کے ہاں یہ روحِ کل سے آدم کی جدائی کی داستان ہے۔ جب کہ مابعد جدید تصورِ بیگانگی کے مطابق کائنات اتفاقات کا سلسلہ ہے۔ یہ کسی متعین آئیڈیالوجی پر نہیں چل رہی ہے۔ اس کے وجود کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہی بے مقصدیت انسان اور اس کی زندگی میں ہے۔ یہ لایعینت مغائرت اور مایوسی کو جنم دیتی ہے۔ ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ بیگانگی کے مابعد جدید تصور کی یوں وضاحت کرتی ہے۔

وسیع و عریض کائنات میں انسان کو اپنے بے جوڑ اور بے مصرف ہونے کا شعور کیا حاصل ہوتا ہے گویا اس پر اپنی بے اوقات خودی کے دہانے کھل جاتے ہیں۔ اور آگہی اس کے لیے مسلسل اور مستقل تعذیب بن جاتی ہے۔ غیر متوقع ور غیر یقینی کا جبر اور اس کے مقابلے میں ارادے کی پسپائی اور اختیارات کی تحدید و پامالی، آرزو اور اس کی تکمیل کے مابین گہری خلیج، معاشرے کی بے معنی تنظیم، ترسیل کی ناکامی اور انسانی رشتوں کا بانجھ پن وغیرہ ایسے تجربات ہیں جو اس کے اپنے وجود کو ہی اس کے لیے بے معنی بنا دیتے ہیں۔ (10)

ii۔ انسانی زندگی پر مغائرت کے اثرات

صوفیانہ یا اختیاری بیگانگی جذب اور سرشاری لیے ہوتی ہے اس لیے اکثر صورتوں میں شخصیت پر مثبت اثرات مرتب کرتی ہے لیکن فلسفیانہ، جبری یا نفسیاتی بیگانگی انسان شخصیت کو شکستہ کر دیتی ہے۔ زندگی کی بے مقصدیت انسان میں فنا کے تصور کو جاگزیں کرتی ہے اور وہ عمر بھر امکانی موت سے نبرد آزما رہتا ہے۔ کامیو کے الفاظ میں زندگی سیفس کا عمل ہے جس کا حاصل لایعنیت اور لغویت ہے۔ کامیو کے ناول کا ہیرو بیگانگی ذات کا شکار ہو کر اپنے اطراف سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ کامیو کے افکار کی وضاحت کرتے ہوئے عتیق اللہ لکھتے ہیں

> "کامیو کے نزدیک زندگی بے قدر و قیمت ہی نہیں مہمل بھی ہوتی ہے۔ اس کے خیال کے مطابق انسان بڑے عزم اور عالی حوصلگی کے ساتھ دنیا میں مقصد اور تنظیم

تلاش کرتا ہے۔ مگر اسے ناکامی ہوتی ہے۔ اور اس ناکامی کے تناؤ ہی سے لغویت نمو پاتی ہے۔" (11)

مارکس کے نظریہ بیگانگی کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام انسان کو اس کے شرف سے بھی گرا دیتا ہے۔ اس نظام میں مزدور کی قدر اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب وہ پیداوار کا مطلوبہ ہدف پورا نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں اس کا خاتمہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کارآمد ہونے کی صورت میں اُس کی موجودگی ضروری ہے۔ مارکس کے نزدیک سرمایہ داری مزدور کو محنت، پیداوار، دوسرے انسانوں اور خود زندگی سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ جو مردم بیزاری، سماجی لاتعلقی، بغاوت اور دیوانگی تک جا سکتی ہے۔ مارکس کے تصورِ بیگانگی پر سید سبط حسن لکھتے ہیں:

"شخصیت کی یہ توڑ پھوڑ اور بشریت کا یہ ضیاع معاشرے کے طبقات میں تقسیم ہونے کا نتیجہ ہے۔ جب تک طبقے وجود میں نہیں آئے تھے بلکہ قبیلوں کی نوعیت بڑے گھرانے کی تھی، معاشرہ ایک سالم وحدت تھا۔ فرد کی شخصیت معاشرے کی اجتماعی شخصیت کا اٹوٹ انگ تھی اور اس کا تخلیقی عمل معاشرے کے تخلیقی عمل کا ایک جز تھا، اس سے پوری طرح ہم آہنگ۔ موجود سرمایہ داری نظام میں طبقاتی تفریق کے باعث بیگانگی ذات کے عمل نے بڑی شدّت اختیار کر لی ہے اور معاشرہ میں بے یقینی، ناآسودگی، اور ذہنی انتشار وباء کی صورت میں پھیل رہا ہے۔" (12)

ب) اردو شاعری میں مغائرت کی مثالیں:

اجنبیت جدید ادب کا ایک پسندیدہ موضوع ہے۔ جن فن کاروں نے داخلیت پر زور دیا ہے اور ذہنی رویے میں وجودیت پسند ہیں ان کی تحریروں میں اجنبیت کی جھلک نمایاں ہے۔ اجنبیت کے احساس کی طاقت ور نمائندگی دوستوفسکی، کافکا، کامیو اور سارتر کے ہاں ملتی ہے۔ اردو افسانوی ادب میں قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، جوگندر پال، انور سجاد، خالدہ اصغر اور رشید امجد نے قائم کی ہیں۔ شاعری میں ن۔ م راشد، اختر الایمان، عمیق حنفی، وزیر آغا اور قاضی سلیم نے اجنبیت کے موضوع پر کئی نظمیں لکھی ہیں۔ اردو میں مجید

امجدؔ، میر اجی، ن م راشدؔ، ساحر لدھیانوی، ساغر صدیقی، ناصر کاظمی، انیس ناگیؔ، زاہد ڈار، منیرؔ نیازی اور ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری میں تنہائی اور بیگانگی کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ جدید دنیا کی تنہائی اور بیگانگی کے ان نمائندہ شعرا کے علاوہ ہمیں یہ احساس اردو کلاسک میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ کہیں اس کی وجہ محبت ہے۔ مثلاً میرؔ کا یہ شعر

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے (13)

بہادر شاہ ظفرؔ نے اسے بالکل ہی مختلف انداز میں دیکھا ہے

دن اور ہے، رات اور، زمیں اور، زماں اور
رہتے ہیں زخود رفتہ جہاں، ہے وہ جہاں اور (14)

کہیں مغائرت تقدیر کے جبر کا شاخسانہ ہے۔ استاد ابراہیم ذوقؔ

لائی حیات، آئے، قضاء لے چلی، چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے (15)

کہیں بیگانگی کی وجہ غریب الوطنی ہے۔ مثلاً وحید الہٰ آبادی کا یہ شعر

میں نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو (16)

کہیں مغائرت کی وجہ قنوطی طرزِ فکر ہے۔ اس احساس کا نمائندہ شاعر فانی بدایونی ہے

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا (17)

غالبؔ کے ہاں یہ احساس ایک نئے انداز میں جلوہ گر ہوا ہے۔ جس نے اسے جدید شعرا کی صف میں لا کھڑا کیا ہے

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو (18)

غزل کے ساتھ ساتھ یہ احساس جگہ جگہ نظم بھی ہوا ہے۔ ن م راشد کی نظم 'خواب کی بستی' بے چہرگی اور بیگانگی کا کرب لیے ہوئے ہے۔

مرے محبوب، جانے دے، مجھے اُس پار جانے دے
اکیلا جاؤں گا اور تیر کے مانند جاؤں گا
کبھی اس ساحلِ ویران پر میں پھر نہ آؤں گا
گوارا کر خدارا اس قدر ایثار جانے دے!
نہ کر اب ساتھ جانے کے لیے اصرار جانے دے!
میں تنہا جاؤں گا، تنہا ہی تکلیفیں اٹھاؤں گا
مگر اُس پار جاؤں گا تو شاید چین پاؤں گا
نہیں مجھ میں زیادہ ہمتِ تکرار جانے دے!
مجھے اُس خواب کی بستی سے کیا آواز آتی ہے؟
مجھے اُس پار لینے کے لیے وہ کون آیا ہے؟
خدا جانے وہ اپنے ساتھ کیا پیغام لایا ہے
مجھے جانے دے اب رہنے سے میری جان جاتی ہے!
مرے محبوب! میرے دوست اب جانے بھی دے مجھ کو

بس اب جانے بھی دے اس ارضِ بے آباد سے مجھ کو (19)

فیض احمد فیض کی نظم 'تنہائی' بظاہر رومانوی ہے لیکن یہ نظم اپنے اندر بے تعلقی، بے چہرگی اور شدید مایوسی لیے ہوئے ہے۔ اس کے آخری دو مصرعے ملاحظہ ہوں۔

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا(20)

منیر نیازی پھیلتے شہروں میں پھیلی تنہائی اور بیگانگی کے احساس کو اپنی نظم ' ایک خواہش' میں خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔

یخ آلود' ٹھنڈی ہوا

بادلوں سے بھری شام ہو

اور طوفاں زدہ بحر کی تند موجوں کی مانند

آوازیں دیتے ہوئے پیڑ ہوں

شہر کی سونی گلیوں میں اڑتے ہوئے خشک پتوں

پر اسرار دروازے کے کھلنے کی مدھم صدا

ریشمی پیرہن سرسرانے کی خوشبوئوں کا شور ہو

اور ہم چپکے بیٹھے

کسی کی جفائیں کسی کی وفا یاد کرتے ہوئے

اپنے بے چین دل کو سہلاتے رہیں (21)

افتخار عارف کی نظم 'بن باس' کی آخری لائنیں۔

رات دن خواب بنتی ہوئی زندگی

دل میں نقد اضافی کی لو

آنکھ بار امانت سے چور

موج خوں بے نیاز مآل
دشت بے رنگ سے درد کے پھول چنتی ہوئی زندگی
خوف واماندگی سے خجل
آرزوؤں کے آشوب سے مضمحل
منہ کے بل خاک پر آپڑی
ہر طرف اک بھیانک سکوت
کوئی نوحہ نہ آنسو نہ پھول
حاصل جسم وجاں بے نشاں رہ گزاروں کی دھول
اجنبی شہر میں
خاک بر سر ہوئی زندگی
کیسی بے گھر ہوئی زندگی (22)

ج) جون ایلیا کی شاعری میں مغائرت کی صورتیں:

جون ایلیا کی شاعری ان کی زندگی کے بے چین اور بے قرار شب و روز کا آئینہ ہے۔ اکثر اس کا اظہار منفی ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جون ایلیا کے ہاں امید و بیم کا تصور ہی نہیں ہے۔ نظم 'سلسلہ تمنا کا' اس کی ایک مثال ہے۔ اس نظم کا آخری حصہ ملاحظہ ہو

کسی کی چشم سے کچھ سلسلہ تو رکھنا ہے
کہ دل کے حال کو پُر ماجرا تو رکھنا ہے
خیالِ ناز و لحاظِ ادا تو رکھنا ہے
جو دل کا خون ہوا ہے اسے بھلا دیں کیا
حسابِ بیش و کمِ خوں بہا تو رکھنا ہے

شبِ دراز جدائی ہے آرزو کی حریف
سوزِ خمِ شوق کو جلتا ہوا تو رکھنا ہے
نہ ٹوٹ جائے کہیں سلسلہ تمنا کا(23)

لیکن یہ نظم اذیت کی یادداشت، اجنبی شام، وصال اور سزا ایسی یاس میں ڈوبی ہوئی نظموں میں گھری ہوئی ہے۔ اپنی نظم مفروضہ میں وہ سانسوں کی جاں کنی کا ذکر کرتے ہوئے سلسلہ کلام کو اس طرح ختم کرتے ہیں۔

ذات ہے اعتبارِ ذات نہیں
اب تو میں خود بھی اپنے ساتھ نہیں(24)

جونؔ ایلیا کے کلام میں جگہ جگہ اجنبیت، لایعنیت اور خود تضحیکی کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی کہتے ہیں

" ایسا شاعر جس نے ایک مخصوص و مضبوط علمی و تہذیبی پس منظر پایا ہو، طرح طرح کے علم حاصل کیے ہوں، حیات و کائنات کے تعلق سے ایک خوشگوار اور صحت مند تصور قائم کیا ہو، لیکن دنیا اس کے مزاج و معیار کے برعکس غلیظ ہو، تقلیب و تخریب کا شکار ہو تو آبگینوں کو ٹھیس لگ جانا اور بیزاریوں اور پیچیدگیوں کا پیدا ہو جانا عین فطری ہے۔" (25)

جون ایلیا نے مابعد جدید عہد کے انسان کے کرب کو عوامی مگر اچھوتے انداز میں نظم کیا ہے۔ یہ اظہار اتنا بے ساختہ اور بے باکانہ ہے کہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی کی لہر اور کرونا وبا کے دوران وائرل ہونے والے اکثر شعر جون ایلیا کے تھے۔ جن میں زیادہ تر اشعار بیگانگی کے موضوع پر تھے

دنیا مرے وجود کی آشوب گاہ ہے
اور اپنے اس ہجوم میں تنہا کھڑا ہوں میں (26)

شاید کی دوسری نظم کا پہلا بند شدید احساس تنہائی لیے ہوئے ہے۔ دنیا جہان سے کٹ کر اپنے کمرے کی کتابوں میں محصور شاعر اپنی ذات کی پنہائیوں میں گم ہے۔

تم جب آؤ گی تو کھویا ہوا پاؤ گی مجھے
میری تنہائی میں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میرے کمرے کو سجانے کی تمنا ہے تمہیں
میرے کمرے میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ان کتابوں نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر
ان میں اک رمز ہے جس رمز کا مارا ہوا ذہن
مژدۂ عشرت انجام نہیں پا سکتا
زندگی میں کبھی آرام نہیں پا سکتا (27)

جونؔ ایلیا کی شاعری میں مایوسی، تنہائی اور بیگانگی کی کیفیات شدت اور کثرت سے بیان ہوئی ہیں۔ نظم اجنبی شام کا یہ حصہ ملاحظہ ہو۔

دھند چھائی ہوئی ہے جھیلوں پر
اڑ رہے ہیں پرند ٹیلوں پر
سب کا رخ ہے نشیمنوں کی طرف
بستیوں کی طرف بنوں کی طرف
اپنے گلوں کو لے کے چرواہے
سرحدی بستیوں میں جا پہنچے
دل ناکام میں کہاں جاؤں
اجنبی شام میں کہاں جاؤں (28)

جون ایلیا کے پہلے مجموعہ کلام شاید کی اس نظم اجنبی شام سے آخری مجموعہ کلام گویا کی نظم ناکارہ تک میں مابعد جدید دور کا یہ المیہ بکھرا ہوا ہے کہ آباد شہر میں کتھارسس کے لیے کوئی ایک بھی میسر نہیں ہے۔

آتا تو، اچھا، کون آتا؟

کس کو آنا تھا، کون آتا[29]

یہ خود کلامیہ شعورِ ذات کے اس گہرے ادراک کا غماز ہے جو کروڑوں کے شہر میں کسی کسی کو میسر ہے۔ شاعر نے تنہائی کے کرب کو بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔ کون آیا ہے؟ آتا تو، اچھا، کون آتا؟ یہاں تشکیک کی شدت نمایاں ہے۔ تشکیک اور مغائرت اس نظم میں ہم آہنگ ہو گئی ہے۔ اذیت ناک تنہائی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر خود کلامی پر مجبور ہے۔ اپنے سے ہم سخنی جون ایلیا کی شاعری کی ایک بڑی شناخت ہے۔

آپ اپنے سے ہم سخن رہنا
ہم نشیں سانس پھول جاتی ہے [30]

جون ایلیا نے اپنے ایک قطعہ اپنی تنہائی کی طوالت کی تجسیم بہت خوبصورت انداز میں کی ہے۔

سال ہا سال اور اک لمحہ
کوئی بھی تو نہ ان میں بل آیا
خود ہی اک در پہ میں نے دستک دی
خود ہی لڑکا سا میں نکل آیا [31]

اسی طرح غزل کے ایک شعر میں تنہائی اور بے دلی کی کیفیت کا بیان دیکھیے۔

کل دوپہر عجیب سی اک بے دلی رہی
بس تیلیاں جلا کے بجھاتا رہا ہوں میں [32]

مغائرت کی بہت سی صورتیں جون ایلیا کی شاعری میں موجود ہیں۔ یہاں صرف تین صورتوں کا ذکر کیا جارہا ہے جو ان کے کلام میں کثرت سے دکھائی دیتی ہیں۔

i۔ لایعنیت

غیر معمولی، عجیب و غریب اور روایتی چیزوں سے دور کرنے والی کیفیت لایعنیت کہلاتی ہے۔ اس کے بہت سے مترادافات ہیں: لغویت، مہملیت، بے مقصدیت، لامقصدیت، ابسرڈٹی وغیرہ۔ یعنی کائنات لایعنیت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ یہ کیفیت اضطراب، انکار اور بغاوت پیدا کرتی ہے۔ انسان روحانی نجات کی بجائے مادی مداوے سوچتا ہے۔ شراب پی کر اس غم کو بھلانا چاہتا ہے یا پھر اپنے جسم میں سوئی چھبو کر احساس کی شدت کو کم کرتا ہے۔

عالم گیر جنگوں میں کروڑوں لوگوں کی ہلاکت نے خدا کے بارے میں موجود تصور تشکیک کا شکار ہو گیا۔ ہر چیز سوالیہ نشان بن گئی۔ اخلاقیات کا تمام ڈھانچہ زمیں بوس ہو گیا اور تمام مہابیانیے رد کر دیے گئے۔ نتیجتاً لامتناہی ابسرڈٹی اور لایعنیت نے جنم لیا اور انسان بیگانگی کے مستقل عذاب کا شکار ہو گیا۔ جب مرکز ہی منہدم ہو گیا تو تمام انسانی رشتے اور نظام بے معنی ہو کر رہ گئے۔

بڑا بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا نئیں (33)

نتیجتاً یورپ میں وجودیت کی تحریک نے جنم لیا۔ اور بے معنویت، لایعنیت اور معدومیت کے رجحانات نے سر اٹھایا۔ البرٹ کامیو کے ناول The Stranger نے اجنبیت کے احساس کو بڑی شدت سے عام کیا۔ اس ناول کا مرکزی کردار 'مرسوو' اپنی والدہ کے مرنے پر بھی جذبات سے عاری ہوتا ہے۔ وہ اسی شام عیاشی کا اہتمام کرتا ہے۔ بعد میں وہ ایک عرب کو بلاوجہ قتل کر کے قید ہو جاتا ہے اور موت کی سزا کا جس انداز میں انتظار کرتا ہے۔ یہ انتظار حیران کن حد تک غیر جذباتی ہے۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ جب اسے لٹکایا جائے تو اس پر لعن طعن کے لیے مجمع جمع ہو۔

یورپ سے شروع ہونے والا لایعنیت کا یہ رجحان دنیا بھر کے لٹریچر پر اثر انداز ہوا۔ اردو ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ گو کہ اردو شاعری میں لایعنیت کوئی نیا مضمون نہیں تھا۔ زندگی کی بے ثباتی کے مضامین اردو شاعری میں شروع ہی سے چلے آرہے ہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میر تقی میرؔ

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا (34)

میرزا اسد اللہ خان غالبؔ

ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی!
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے (35)

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقہ دام خیال ہے (36)

لیکن ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل میں شروع ہونے والی جدیدیت کے تحریک نے جن رجحانات کو عام کیا، لایعنیت ان میں سے ایک ہے۔ مابعد جدیدیت نے اس منفیت کو اور شدید کر دیا۔ جونؔ ایلیا پر یہ اثرات ضرور پڑے ہوں گے لیکن جیسا کہ دوسرے باب میں جونؔ ایلیا کی شاعری میں مغائرت کے محرکات کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ ان میں یہ رجحانات خلقی تھے۔ جو وقت کے ساتھ شدید ہوتے چلے گئے۔ ان کی تمام شاعری میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ پہلے شعری مجموعہ شاید میں انیس الفاظ پر مشتمل ایک تین سطری نظم 'بے اثبات' کا یہی موضوع ہے۔ بیگانگی، لایعنیت اور زندگی کی بے معنویت کے فلسفیانہ ادراک کو جون ایلیا نے سادگی، جامعیت اور شدت سے پیش کیا ہے

کس کو فرصت کہ مجھ سے بحث کرے
اور ثابت کرے کہ میرا وجود

زندگی کے لیے ضروری ہے (37)

جونؔ ایلیا کی غزلیات کے بڑے مضامین میں سے ایک لایعنیت ہے۔ کچھ اشعار بطور نمونہ درج ہیں۔

یہ خراباتیان خرد باختہ
صبح ہوتے ہی سب کام پر جائیں گے (38)

کوئی معنے نہیں کسی شے کے
اور ہوں بھی میاں تو تب کیا؟ (39)

ہم جی رہے ہیں کوئی بہانہ کیے بغیر
اُس کے بغیر، اُس کی تمنا کیے بغیر (40)

بودش جو ہے وہ اِک تماشا ہے گماں کا
ہے جو بھی حقیقت وہ فسانے کے لیے ہے (41)

رائیگاں وصل میں بھی وقت ہوا
پر ہوا خوب رائیگاں جاناں (42)

کام کی بات میں نے کی ہی نہیں
یہ میرا طور زندگی ہی نہیں (43)

ii۔ خود تضحیکی

جون ایلیا کی اکثر خصلتیں مرزا اسد اللہ خان غالبؔ میں پائی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک خود تضحیکی ہے۔ مرزا غالبؔ میر زا قربان علی بیگ سالکؔ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں خدا سے بھی توقع نہیں مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں اپنے کو اپنا غیر تصور کرتا ہوں۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں لو غالبؔ کو ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ

میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں ہے۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالبؔ کیا مرا، بڑا ملحد امرا، بڑا کافر مرا ۔۔۔ ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں ۔۔۔ آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ 'کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو'۔ بولے کیا؟ بے حیا؛ بے غیرت؛ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، برازسے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام، قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دے گا؟"۔ (44)

جونؔ ایلیا نے بھی اپنی شاعری میں جابجا اعتراف کیا کہ وہ بڑے نہیں ہو سکے اور رائیگاں گزر گئے۔ انسٹھ سال کی عمر میں چھپنے والے اپنے پہلے مجموعہ کلام کے دیباچے کا آغاز اسی اعتراف سے ہوتا ہے۔

"یہ ایک ناکام آدمی کی شاعری ہے۔ یہ کہنے میں کیا شرمانا کہ میں رائیگاں گیا۔ مجھے رائیگاں ہی جانا بھی چاہیے تھا۔ جس بیٹے کو اس کے انتہائی خیال پسند اور مثالیہ پرست باپ نے عملی زندگی گزارنے کا کوئی طریقہ نہ سکھایا ہو بلکہ یہ تلقین کی ہو کہ علم سب سے بڑی فضیلت ہے اور کتابیں سب سے بڑی دولت تو وہ رائیگاں نہ جاتا تو اور کیا ہوتا"۔ (45)

جونؔ ایلیا کی اس اذیت کی ایک وجہ ان کی مثالیہ پسندی ہے۔ ایک برتر ذہنی سطح کا آدمی ایسے ماحول میں گھر گیا ہے جس میں علم کی کوئی قدر ہے نہ دلیل کی کوئی قیمت۔ نظریاتی پہرہ داروں کے سطحی جوابات نے اس فلسفی شاعر کو وجودی اذیت میں مبتلا کیے رکھا۔ کڑا سماجی جبر انہیں بودے جوابات سننے اور خاموش رہنے پر مجبور کرتا رہا۔

ایک ہی حادثہ تو ہے اور وہ یہ کہ آج تک
بات نہیں کہی گئی بات نہیں سنی گئی (46)

اس کا نتیجہ خود اذیتی کی صورت میں نکلا۔ اس کی ایک وجہ وہ آشوبِ آگہی ہے جس سے شاعر گزر رہا ہے۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام شاید کی دوسری نظم 'رمز' اس آگہی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس سے شاعر بہرور ہے۔

ان کتابوں نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر
ان میں اک رمز ہے جس رمز کا مارا ہوا ذہن
مژدہ عشرت انجام نہیں پا سکتا
زندگی میں کبھی آرام نہیں پا سکتا (47)

یہ جبر شاعر کو خود اذیتی پر مجبور کر رہا ہے۔ اور یہی خود اذیتی ایک سطح پر جا کر سکون بخش بن جاتی ہے۔ مثالیہ پسند جون ایلیا جب عملی زندگی کو اپنے اندرون سے مختلف پاتا ہے تو اکیلے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی اکیلا پن بعد میں تنہائی اور احساسِ بیگانگی کا باعث بنتا اور اسے مجہول ذہنی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

روشنی بھر گئی نگاہوں میں
ہو گئے خواب بے اماں جاناں (48)
حال یہ ہے کہ خواہش' پرسش حال بھی نہیں
اس کا خیال بھی نہیں' اپنا خیال بھی نہیں
میرے زمان و ذات کا ہے یہ معاملہ کہ اب
صبح فراق بھی نہیں' شام وصال بھی نہیں (49)

جون ایلیا کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی میں بھی لایعنیت کی مثالیں ملتی ہیں۔ عرفان جاوید نے اس ضمن میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے

" ڈاکٹر توقیر ارتضیٰ مستند شاعر اور منجھے ہوئے بیوروکریٹ ہیں۔ وہ اپنے آبائی شہر، ایبٹ آباد میں طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے تو خبر اُڑی کہ جون ایلیا وہاں ایک مشاعرے کی صدارت کرنے آرہے ہیں۔ وہ جون کی شاعری کے مدّاح تھے، سو

مقررہ تاریخ کو مجوزّہ مقام پر مشاعرے میں بہ طور سامع پہنچ گئے۔ مشاعرہ خوب جما اور جون نے تو گویا محفل لوٹ لی۔ اسی دوران جون کچھ زیادہ ہی خمار میں آ گئے۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو توقیر صاحب صدرِ مشاعرہ، جون سے اظہارِ عقیدت کے لیے آگے بڑھے۔ تب تک اسٹیج خالی ہو چکا تھا اور جون کرسیٔ صدارت چھوڑ کر اسٹیج پر قلابازیاں لگا رہے تھے۔ وہ ایک کونے سے قلابازی لگانی شروع کرتے اور دوسرے کونے تک چلے آتے۔ یہ معمول دوسرے کونے سے تیسرے کے لیے شروع ہو جاتا۔ توقیر صاحب بہت صبر سے ایک کونے میں کھڑے ہو گئے اور انتظار کرنے لگے۔ جون صاحب لوٹنیاں لگاتے ہوئے وہاں پہنچے اور اگلے مرحلے کے لیے تیار ہونے لگے تو توقیر صاحب نے انتہائی عجز و ادب سے انھیں بتایا کہ وہ جون صاحب کے بہت مدّاح ہیں۔ یہ سن کر جون کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور بولے "جانی! اگر اتنے ہی مدّاح ہو، تو آؤ میرے ساتھ قلابازیاں لگاؤ۔" (50)

iii۔ خود انہدامی

اجنبیت کا ایک نتیجہ لایعنیت کی صورت میں نکلا۔ انسانی احساسات مشینوں کی نذر ہوئے تو اجتماعیت کی بجائے فردیت کو فروغ ملا۔ جس سے سماجی مغائرت اور زیادہ بڑھ گئی۔ زیادہ حساس تخلیق کاروں کے لیے یہ آشوب ناک صورت حال تھی۔ زندگی میں کبھی آرام نہ ملنے کا احساس اسے خود اذیتی پر مجبور کر دیتا ہے اور یہی خود اذیتی ایک سطح پر جا کر عادت بن جاتی ہے۔ جو شاعر کو مجہول ذہنی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جس اظہار ہمیں جگہ جگہ ان کی شاعری میں ملتا ہے۔

ہاں ٹھیک ہے میں اپنی انا کا مریض ہوں
آخر مرے مزاج میں کیوں دخل دے کوئی
میں خود یہ چاہتا ہوں کہ حالات ہوں خراب
میرے خلاف زہر اگلتا پھرے کوئی (51)

علاج یہ ہے کہ مجبور کر دیا جاؤں
وگرنہ یوں تو کسی کی نہیں سنی میں نے (52)

تاہم جان ایلیا اس مایوس کن صورتِ حال کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور شاعری میں نہ صرف اسے جوں کا توں پیش کرتا ہے بلکہ اس کی تزئین کرتا ہے۔ یوں خود اذیتی اسے راس آجاتی ہے۔ خود اذیتی کی ایک صورت بیماریوں کو پسند کرنا تھا۔ شاید کا دیباچہ بتاتا ہے کہ جون ایلیا کے نزدیک دق رومان کا درجہ رکھتی تھی کیونکہ وہ اس دور کے انقلابی نوجوانوں کی بیماری تھی۔ (53) بواسیر چونکہ ان کے بڑے بھائی رئیس امروہوی کو لاحق تھی، اس لیے انہیں پسند تھی اور جب انہیں ہوئی تو یہ بہت خوش ہوئے کہ بھائی کو جو بیماری ہے وہ ہمیں بھی ہو گئی۔ (54)

جون ایلیا رشتوں ناتوں کے بھی زیادہ قائل نہیں تھے۔ جب فطرت کے ہاں جدائی ناگزیر ہے تو پھر رشتوں کو بنائے رکھنے کی جدوجہد کیا معنی رکھتی ہے؟

نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم؟
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم؟
خموشی سے ادا ہو رسم دوری
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم؟
یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں
وفا داری کا دعویٰ کیوں کریں ہم؟(55)

خاندانی رشتے اور سماجی رابطے کمزور پڑیں تو انسان اپنی ذات کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں تشکیک، تنہائی، اداسی، بغاوت اور بیگانگی جنم لیتی ہے۔ مذکورہ غزل کے علاوہ ان کا کافی کلام انہی کیفیات کا مظہر ہے۔ ایک اور غزل کے دو اشعار بطورِ نمونہ ملاحظہ ہو

کسی سے عہد و پیماں کر نہ رہیو

تو اس بستی میں رہیو پر نہ رہیو
نظر پر بار ہو جاتے ہیں منظر
جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو(56)

جون ایلیا کا یہ دکھ صرف ذاتی نہیں تھا۔ وہ انسانیت کی اجتماعی بے حسی پر بھی ماتم کناں تھے۔ وہ مشین کی حاکمیت کے خلاف تھے جس نے انسان کو میکانکی اور مشین بنا دیا ہے۔ جو بیگانگی کی بڑی وجہ ہے۔ ان کی ایک مسلسل غزل کے کچھ اشعار جس میں مشین ردیف ہے

شہر اپنے بسائیں گے جنگل
تجھ میں اگنے کو اب ہے گھاس مشین
ایک پُرزہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا
اب رکھا کیا ہے تیرے پاس مشین (57)

یہ بیگانگی مایوسی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ دبئی میں جشنِ پیر زادہ قاسم میں جب نقیب محفل سلیم جعفری نے جون ایلیا کو جون اولیا کہہ کر زحمتِ کلام دی تو جونؔ ایلیا نے کہا کہ

"نہ میں جون ایلیا ہوں، نہ میں جون اولیا۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔۔۔ میں ہار چکا ہوں، میں معاشرے کو اپنی اقدار پر لانا چاہتا تھا۔ یہ وہ معاشرہ نہیں ہے۔ یہ افلاطون کا معاشرہ نہیں ہے، یہ مارقس ایورلس کا معاشرہ نہیں۔ میں حرام اور حلال کے معیار توڑنا چاہتا تھا۔۔۔ یہ بونوں کا معاشرہ ہے۔ میں بونا شاعر ہوں۔" (58)

بونوں کے معاشرے میں زندہ رہنا جون ایلیا کے لیے آسان نہ تھا۔ انہی کا ایک شعر ان کی قبر کا کتبہ بنا جو ان کی خود انہدامی کا اعترافیہ بھی ہے اور ان کی کیفیات کا بہترین مظہر بھی۔

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں (59)

مختصراً مغائرت ایک ذہنی کیفیت ہے۔ جو فرد کو معاشرے اور اس کے معاملات سے ہی نہیں، اسے اس کی ذات تک سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ جو شخصیت کو گہنا دیتی ہے۔ مختلف فلسفیوں نے مغائرت کی وجوہات مختلف بیان کی ہیں۔ ہیگل اسے روح کی خود سے علیحدگی کا نام دیتا ہے۔ کارل مارکس نے مغائرت کو سماجیاتی تناظر میں دیکھا ہے اور اسے سرمایہ داری کی دین بتایا ہے۔ جو انسان کی بجائے اشیا کو اہمیت دیتی ہے۔ پیداوار سے مزدور کی لاتعلقی مغائرت کا باعث بنتی ہے۔ وجودی تصور بیگانگی فرد کو اجتماع کی بھینٹ چڑھانے کا مخالف ہے۔ ان کے ہاں وجود جوہر پر مقدم ہے۔ سارتر کے بقول انسان اس کے علاوہ کچھ نہیں جو کچھ کہ اپنے آپ کو بناتا ہے۔ مابعد جدید تصورِ بیگانگی زندگی کی بے مقصدیت سے پھوٹتا ہے۔ یہ بے مقصدیت اور لایعنیت اجنبیت اور مایوسی کو جنم دیتی ہے اور انسانی شخصیت شکستہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ کچھ دیگر جدید شعرا کی طرح جون ایلیا کے ہاں بھی اجنبیت کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے مابعد جدید انسان کی مایوسی، تنہائی اور بیگانگی کو شدت اور کثرت سے نظم کیا ہے۔ ان کا یہ کلام بدلتے ہوئے حالات و واقعات میں نئی معنویت دیتا ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی کی لہر اور پھر کرونا وبا کے دوران سب سے زیادہ یہی اشعار وائرل ہوئے۔ یہ سلسلہ ان کے پہلے مجموعہ کلام شاید سے ان کے آخری مجموعہ کلام گویا تک پھیلا ہوا ہے۔ اکثر یہ بیگانگی اور تشکیک ایک ساتھ بھی ملتی ہے۔ جگہ جگہ خود کلامی مغائرت ہی کا شاخسانہ ہے۔ لایعنیت اور رائیگانی کا کرب جس قدر بڑھتا جاتا ہے بیگانگی اور مغائرت کا احساس اسی قدر شدید ہوتا چلا جاتا ہے اور بلآخر اضطراب، انکار اور بغاوت پر منتج ہوتا ہے۔ کسی کے نہ ہونے کا احساس اور مرکزیت کا انہدام جس لامتناہی لایعنیت کو جنم دیتا ہے وہ انسانی رشتوں ناطوں کی عمارت کو زمیں بوس کر دیتی ہے۔ یوں تو مغائرت کا احساس کلاسک شعرا کے ہاں بھی ملتا ہے لیکن جدیدیت نے اس رجحان کو عام کیا۔ مابعد جدیدیت نے اس شدید تر کر دیا۔ جونؔ ایلیا کی حیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں مغائرت کے رجحانات خلقی تھے۔ جنہیں لایعنیت، بے مقصدیت اور مہملیت نے شدید تر کر دیا۔ وہ خود تضحیکی پر اتر آئے۔ رائیگانی کا دکھ وہ عمر بھر جھیلتے رہے۔ جس کی بڑی وجہ ان کی مثالیہ پسندی ہے۔ ایک بیمار معاشرے نے انہیں وجودی اذیت میں مبتلا کیے رکھا۔ جہاں بات کرنے کی اجازت ہی نہ ہو وہاں خود اذیتی قابل فہم ہے۔ یہ خود اذیتی مثالیہ پسند جون ایلیا کے لیے تخلیقی وفور کا باعث بنتی

رہی وہ اس مایوس کن صورتِ حال کی شعری تجسیم اور تزئین کرتے رہے۔ یہ کیفیات ان کے پانچوں مجموعہ ہائے کلام پر محیط ہیں۔ جہاں ہر طرف تشکیک، تنہائی، اداسی، بغاوت اور بیگانگی بکھری ہوئی ہے۔

حوالہ جات

1۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، الفیصل ناشران، لاہور، جلد چہارم، 2017ء، ص376

2۔ سلیم شہزاد، فرہنگ ادبیات، منظر نما، مالیگاؤں، بھارت، 1998ء، ص19

3۔ عتیق اللہ، ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، اردو منزل دہلی، 1995ء، ص114

4۔ ایضاً

5۔ محمد صفدر میر، مارکس کا نظریۂ بیگانگی، مکتبہ دانیال، کراچی، 1987ء، ص87

6۔ کارل مارکس، داس کیپٹل، مترجمہ سید محمد تقی، دار لشعور، لاہور، 2004ء، ص77

7۔ Judy Pearsall, Concise Oxford Dictionary, 12, OUP, London, 10th Edition, 1999, P499

8۔ سارتر، جین پال، ایگزسٹنشلزم از ہیومنزم، ورلڈ پبلشنگ کمپنی، یو ایس اے، 1956ء، ص174

9۔ افتخار بیگ، ڈاکٹر، وجودیت اثباتِ ذات کا فلسفہ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، 2013ء، ص108

10۔ عتیق اللہ، ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، اردو منزل دہلی، 1995ء، ص34

11۔ ایضاً

12۔ سید سبط حسن، (تعارف) محمد صفدر میر، مارکس کا نظریۂ بیگانگی، مکتبہ دانیال، کراچی، 1987، ص 5

13۔ میر تقی میر، دیوان پنجم، مشمولہ: مزامیر یعنی انتخاب کلام میر، اثر لکھنوی، کتابی دنیا، دہلی، 1947، ص664

14۔ بہادر شاہ ظفر، مارکس کا تصورِ بیگانگی اور ہمارے شعراء از محمد سلطان، www.humsub.com.pk، 20 جولائی، 2020ء، 11:34pm

15۔ ابراہیم ذوق، کلیاتِ ذوق، مرتبہ ڈاکٹر تنویر علوی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1989ء، طبع دوم، ص 305

16۔ وحید آلہ آبادی، نقوش، نقوش پریس لاہور، مئی جون 1945ء، ص428

17۔ فانی بدایونی، عرفانیاتِ فانی، انجمن ترقی اردو، دہلی، 1939ء، ص15

18۔ اسد اللہ خان غالبؔ، دیوانِ غالب، مرتبہ پروفیسر حمید احمد خان، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص300

19۔ ن م راشد، کلیاتِ راشد، کتابی دنیا، دہلی، 2011ء، ص26

20۔ فیض احمد فیض، تنہائی (نظم)، نقشِ فریادی، اردو گھر، دہلی، 1941ء، 72

21۔ منیر نیازی، جنگل میں دھنک، (نظم)، نیا ادارہ، لاہور، ص33

22۔ افتخار عارفؔ، بن باس (نظم)، مہر دو نیم، حسین، لندن، 1983ء، ص81

23۔ جون ایلیا، سلسلہ تمنا کا، (نظم) شاید، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، طبع ہفتم، 1998، ص63

24۔ جون ایلیا، شاید، ص248

25۔ علی احمد فاطمی، ڈاکٹر، جون ایلیا- بیزاری و بغاوت کا شاعر، خوش گزراں گزر گئے، مرتبہ نسیم سید، اکادمی بازیافت، کراچی، طبع اول، 2011ء، ص37

26۔ جون ایلیا، شاید، ص308

27۔ ایضاً، ص44

28۔ ایضاً، ص150

29۔ جون ایلیا، گویا، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2011ء، طبع دوم، ص260

30۔ جون ایلیا، گمان، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2004ء، ص192

31۔ جون ایلیا، شاید، 219

32۔ ایضاً، ص105

33۔ ایضاً، ص177

34۔ میر تقی میر، دیوان اول، مشمولہ: مزامیر یعنی انتخاب کلامِ میر، اثر لکھنوی، کتابی دنیا، دہلی، 1947، ص71

35۔ اسد اللہ خان غالب، دیوان غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، شیخ غلام علی، لاہور، 1967ء، ص228

36۔ اسد اللہ خان غالبؔ، دیوانِ غالب، مرتبہ پروفیسر حمید احمد خان، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص189

37۔ جون ایلیا، شاید، ص78

38۔ جون ایلیا، شاید، ص113

39۔ جون ایلیا، یعنی، ص105

40۔ جون ایلیا، گویا، ص27

41۔ جون ایلیا، گماں، ص55

42۔ جون ایلیا، شاید، ص182

43۔ جون ایلیا، گمان، ص49

44۔ غالبؔ بنام مرزا قربان علی بیگ خاں سالکؔ، 11 جولائی 1864، خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، ص94

45۔ جون ایلیا، شاید، ص11

46۔ جون ایلیا، گویا، ص31

47۔ جون ایلیا، شاید، ص44

48۔ جون ایلیا، شاید، ص182

49۔ جون ایلیا، شاید، ص120

50۔ عرفان جاوید، جنگ، سنڈے میگزین، شخصیت، جون ایلیا (پہلی قسط)، 01اپریل، 2018ء

51۔ جون ایلیا، شاید، ص130

52۔ جون ایلیا، شاید، 103

53۔ جون ایلیا، شاید، ص19

54۔ شاہانہ رئیس، چچا جون، ص

55۔ جون ایلیا، شاید، ص125

56۔جون ایلیا، شاید، ص161

57۔جون ایلیا، شاید، ص128

58۔ جون ایلیا، جشنِ پیرزادہ قاسم، www. Youtube.com، 24جولائی 2020ء، pm10:20

59۔ جون ایلیا، شاید، ص120

باب پنجم

ماحصل

الف) مجموعی جائزہ:

جون ایلیا کا شمار اس عہد کے مقبول شعرا میں ہوتا ہے۔ نصیر ترابی نے اپنی کتاب شعریات میں شعرا کی درجہ بندی کرتے ہوئے انہیں معتبر شعرا میں شمار کیا ہے۔ ان کا تعلق یوپی، ہندوستان کے تہذیبی مرکز امروہہ کے ایک ذی علم گھرانے سے تھا۔ ان کی بنیادی شناخت شاعری تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں فلسفے سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے والد اور بھائی فلسفی تھے۔ وہ خود بھی فلسفے کے طالب علم رہے ہیں۔ اس لیے وہ صاحب علم اور حقائق اولیٰ کے جویا تھے۔ ان کی فکر کا دائرہ انسان سے کائنات تک پھیلا ہوا ہے۔ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟ کی طرح کے سوالات سے اسد اللہ غالبؔ نے اردو شاعری کو جو فکری اٹھان دی تھی، جون ایلیا نے اس عمل کو اور آگے بڑھایا۔ یہ سب محض شعر گوئی کے لیے نہیں تھا۔ وہ انسان، کائنات، خدا اور ان تینوں کے تعلق کی نوعیت کو سمجھنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ عمل یقینیات سے شروع ہوتا ہے۔ فلسفیانہ مزاج کے باعث وہ آہستہ آہستہ سوالات اٹھاتے ہیں۔ لیکن انہیں کسی سوال کا جواب نہیں ملتا۔ اس سے یقین کی عمارت میں دراڑ پڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً وہ گمان اور تشکیک کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں۔ لیکن یہ پناہ بھی عارضی ثابت ہوتی ہے وہ یہاں بھی نہیں رہ پاتے اور لاادریت، الحاد اور انکار کی طرف نکل جاتے ہیں۔

عام طور پر مذہبی پس منظر کے لوگ جب تشکیک کی راہ پر نکلتے ہیں تو کچھ عرصے بعد لوٹ آتے ہیں۔ لیکن جون ایلیا لوٹنے کی بجائے آگے ہی نکلتے چلے گئے۔ ان کی نظم رمز ہمیشہ ان کے تعقل کے اس سفر کا دلچسپ احوال بیان کرتی ہے۔ اور ان کی تشکیکی فکر کی تشکیل کی تفہیم میں اساسی اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں اس سفر کے مختلف مراحل کو بہت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ ابتدائی حصے میں شاعر نے زندگی کے سعد ادوار کے خوش ماجرا روز و شب کا ذکر کیا ہے۔ تب خواب اور حقیقت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ایک طلسماتی یقین کا

سحر تھا۔ الوہی احساسات ہر وقت انہیں سرشار رکھتے تھے۔ ہر لفظ بامعنی تھا۔ ہر چیز روح کی توسیع تھی۔ سوال پیدا ہی نہیں ہوتے تھے اور اگر پیدا بھی ہوتے تو خود بخود جوابات ملنا شروع ہو جاتے۔ معجزے معمول کا درجہ رکھتے تھے۔ نظم رمز ہمیشہ کی ابتدا عزاخانہ شاہ مسکین میں ہونے والے تازہ معجزے سے ہوتی ہے۔ جہاں ایک نوجوان جاں کنی کی حالت میں لایا جاتا ہے۔ اس پر علم پھیرا جاتا ہے اور وہ دفعتاً اٹھ بیٹھتا ہے۔ شاعر نے اس دور کے خوش ماجرا روز و شب کی نقشہ کشی بہت خوبصورت انداز میں کی ہے۔ روحانی سرشاری کے اس دور کے لیے عقلِ انگیزہ کی آمد مہلک ثابت ہوتی ہے۔ یقین کی سرمستیاں دم توڑنے لگتی ہیں۔ خوش گمانیوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ آگہی کا جہنم بھڑکتے ہی خوش ماجرا روز و شب بکھر جاتے ہیں اور فیضِ توفیق کی رسد رکتے ہی لفظ معانی سے خالی ہو جاتے ہیں۔ درماندگی، بیگانگی اور تشکیک انہیں گھیر لیتی ہے۔ شک جسم و جان میں سرایت کر جاتا ہے۔ ہر چیز کے وجود پر شک گزرنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ خواب میں بھی وہ چیزوں کو خواب ہی سمجھتے ہیں۔

تمہارے رنگ مہکتے ہیں خواب میں جب بھی
تو ان کو خواب میں بھی خواب ہی سمجھتے ہیں

وہ گمان کو منزل سمجھنے لگتے ہیں۔ انہیں یہ کرب راس آ جاتا ہے۔ وہ اپنے اس کرب میں رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن مستقل قیام ان کے مزاج کے خلاف ہے۔ متجسس ذہن انہیں مضطرب رکھتا ہے۔ انہیں یقین کے ساتھ ساتھ گمان بھی بے لباس دکھنے لگتا ہے اور یہ بے لباسی انہیں بے اماں کر دیتی ہے۔

بخشش ہوا یقین گماں بے لباس ہے
اک آگ جامہ زیب، دھواں بے لباس ہے

جون ایلیا لاادری بن جاتے ہیں۔ جہاں سے وہ الحاد میں داخل ہوتے ہیں اور آخر میں سب کچھ سے انکار کر دیتے ہیں۔

انکار ہے تو قیمتِ انکار کچھ بھی ہو
یزداں سے پوچھنا یہ ادا اہرمن میں تھی

اس کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لفظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ وہ لفظ اور معنی کے رشتے کی ردِ تشکیل کرتے ہیں۔ وہ لفظ کو زبان کا فطری نتیجہ سمجھتے ہیں اور اس کے کسی متعین معنی کے قائل نہیں ہیں۔ شاید میں شامل ان کی ایک نظم ملاحظہ ہو جس میں وہ لفظ کی معنی پر برتری ثابت کر رہے ہیں۔ یہ کثیر المعنویت اور بے معنویت ایک مابعد جدید رویہ ہے۔

ہاں لفظ ایجاد ہیں
یہ ہزاروں، ہزاروں برس کے
سراسیمہ گر اجتہاد تکلم کا انعام ہیں
ان کے انساب ہیں
جن کی اسناد ہیں
اور پھر ان کی تاریخ ہے
اور معنی کی کوئی تاریخ نہیں۔۔!

جون ایلیا کسی مسلمہ قدر پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ اس پر طنزیہ انداز میں سوال اٹھاتے اور روایتی تصورات کی رد تشکیل کرتے ہیں۔ یہ رویہ ان کی ذات سے لے کر مابعد الطبیعات تک پھیلا ہوا ہے۔

حاصلِ کن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

اور ان کا مشہور شعر

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا؟

نظم میں ان کے تعقل کا سفر جس ترتیب سے بیان کیا گیا ہے یہ صرف نظم کی حد تک ہے۔ اس سلسلے میں نہ ارتقائی مراحل کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، نہ کسی زمانی ترتیب کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان کی فکر کا کہیں مستقل پڑاؤ نہیں رہا۔ ہر دور میں ہر طرح کے اشعار ملتے ہیں۔ افسانہ نگار ذکا الرحمان نے جنگ لاہور کے دفتر

میں جون ایلیا اور مولانا فضل الرحمن کے جس مناقشے کا ذکر کیا ہے وہ ان کی وفات سے پانچ سال پہلے کا ہے جس میں وہ اپنی سیادت پر نازاں دکھائی دیتے ہیں۔

ایک خیال یہ ہے کہ جون ایلیا کا معروف اِباحی کلام تنزیہہ کے ذیل میں آتا ہے۔ دلیل کے طور جون ایلیا کے شاید کے دیباچے نیاز مندانہ میں تنزیہہ کے بارے میں حضرت علی کے قول کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔ لیکن جون ایلیا کی شخصیت اور کلام کے گہرے مطالعے سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ جس طرح انہوں نے خدا کی ہستی اور اس کی تخلیق پر سنجیدہ سوالات اٹھائے ہیں۔ اسی طرح دیگر معاملات کے بارے میں بھی سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے یہ شعر سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

خدا نہیں ہے تو کیا حق کو چھوڑ دیں اے شیخ!
غضب خدا کا ہم اپنے امام کے نہ رہیں

جون ایلیا کے والد شیعہ عالم اور ذاکر تھے۔ امروہہ شعیت کا ہی مرکز نہ تھا، شعیہ مخالف آوازیں بھی وہاں سے گونجیں۔ ان میں ایک معتبر آواز محمود احمد عباسی کی تھی جو امروہہ ہی سے بلند ہوئی۔ امروہہ میں جون ایلیا کا گھر مذہبی مباحثوں اور مناظروں کا مرکز تھا۔ اس ماحول کے اثرات ان پر مرتب ہونا ناگزیر تھا۔ وہ کسی حد تک ان مذہبی روایات سے تہذیبی طور پر جڑے رہے، لیکن اس سے ان کا شیعہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ کیوں کہ انہوں نے شیعہ ازم کے دفاع میں کبھی کوئی بات نہیں کی، نہ ہی کسی اور مسلک و مذہب کے حامی رہے۔ انہیں مجموعہء اضداد کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یقین سے بے یقینی تک کا ہر رنگ ان کے ہاں ملتا ہے۔ لوگ بھی ان کے بارے میں مختلف الآرا ہیں۔ جون ایلیا کے قریبی عزیز سید محمد سیادت علی نقوی انہیں مذہبی آدمی سمجھتے ہیں۔ جون ایلیا کی بیٹی سوہاہنہ ایلیا اپنے والد کو ایتھیسٹ بتاتی ہے۔ یہ متنوع آرا بتاتی ہیں کہ ان پر کوئی مخصوص مذہبی اور مسلکی چھاپ نہیں تھی۔ یہی مابعد جدید رویہ ہے۔ اس لیے ان پر کوئی مخصوص لیبل

نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک طرف ان کے چاہنے والے انہیں اولیا، سرکار، مرشد اور دیگر مقدس خطابات سے یاد کرتے ہیں۔ جب کہ مخالفین انہیں ملحد، دھریہ، یہودی اور اسی قسم کے نفرت انگیز ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باجود جون ایلیا کی مقبولیت روز افزوں ہے۔ یہ صارفیت جون ایلیا کے مابعد جدید شاعر ہونے کی علامت ہے۔

جیسا کہ چچا جون میں شاہانہ رئیس نے لکھا ہے اور اور دیگر آثار سے بھی لگتا ہے کہ تشکیک ان کے خمیر میں گندھی ہوئی تھی۔ حالات وواقعات نے اس کیفیت کو پروان ضرور چڑھایا لیکن اس کی بنیاد خود ان کی ذات تھی۔ ہجرت سے پہلے بھی کم و بیش ان کی عادات ایسی ہی تھیں۔ لیکن تقسیم، ہجرت اور دوسرے دکھوں نے اس کیفیت کو اور بڑھا دیا۔ انہیں گنگا جمنی تہذیب سے علاحدگی کا دکھ تھا۔ جو ناسور بن کر ان کی رگ وپے میں سرایت کر گیا اور تا عمر انہیں اندر ہی اندر سے چاٹتا رہا۔ اگر شاعری ان کا کتھارسس نہ کرتی تو بہت پہلے وہ مر چکے ہوتے۔

ان کی شاعری موضوعات سے زیادہ کیفیات کا مرقع ہے۔ ان کے بارے میں احمد جاوید نے بجا طور پر کہا ہے کہ وہ سوچنے والے اعصاب رکھتے تھے۔ ان کی شاعری ان متنوع کیفیات کا دھنک رنگ اظہار ہے۔ مابعد جدید انسان کی ناآسودگی، تنہائی، بیگانگی، برہمی، تشکیک اور انکار کے تقریباً تمام شیڈز ان کے ہاں ملتے ہیں۔ جو بہ قول محمد علی صدیقی کہیں ویدوں کی طرح منضبط اور کہیں ملفوضات کی طرح بے ترتیب ہیں۔ ان کے ہاں مضامین کا احاطہ کرنا اور ان کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ ایک کیفیت کب بدلتی ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

پوسٹ ماڈرن رجحان روایت کے خلاف ری ایکشن کے نتیجے کے طور پر منظر عام پر آیا تھا۔ جون ایلیا کی شاعری کا بڑا حصہ بھی ری ایکشنری ہے۔ اس طرح اردو شاعری میں جون ایلیا مابعد جدید فکر کے بہترین نمائندہ ہیں۔ ان کا پیرائیہ اظہار طنزیہ ہے۔ معاشرتی اقدار سے مہابیانیے تک ان کی طنز کی زد میں ہیں۔ وہ ہر چیز سے کھلواڑ کرتے اور اسے تماشا بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ اس سے ان کی ذات بھی محفوظ نہیں ہے۔ وہ اپنی بیماری کو بھی چالاکی قرار دیتے ہیں۔ انہیں اعتراف ہے کہ وہ خون لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے تھوکتے ہیں۔

جون ایلیا کے نزدیک حقیقت کی بجائے اس کا گمان حقیقت ہے۔ اس لیے زندگی میں معنویت کی تلاش فضول ہے۔ جیسا کہ عنبریں حسیب عنبر نے اپنے مضمون "جون ایلیا اور زندگی کی معنویت" میں لکھا ہے کہ زندگی کی بے معنویت جون ایلیا کا بنیادی مسئلہ اور ان کے شخصی اور فکری انتشار کی بنیاد ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ تشکیک، مایوسی اور بیگانگی کا شکار ہو گئے۔ اس کا اظہار "شاید" کی تین سطری نظم "بے اثبات" میں یوں ہوتا ہے

کس کو فرصت کہ مجھ سے بحث کرے
اور ثابت کرے کہ میرا وجود
زندگی کے لیے ضروری ہے؟

جون ایلیا کے ہاں بے ہیئتی اور بے ترتیبی اسی بے معنویت کا شاخسانہ ہے۔ وہ بے ترتیبی کو ہی ترتیب سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی پر کسی ضابطے کی پابندی گوارا نہیں کرتے۔ انہیں گماں کی طرح انہیں بے ترتیبی کے زیاں کا بھی ملال ہے۔ اگر کہیں انہیں مصلحت اختیار بھی کرنا پڑتی ہے تو یہ ان پر گراں گزرتی ہے۔

یہ خراباتیان خرد باختہ
صبح ہوتے ہی سب کام پر جائیں گے

جون ایلیا کی شاعری ان کی بے چین زندگی کی عکاس ہے۔ مغائرت کا احساس جون ایلیا کے رگ و پے میں سرائیت کیے ہوئے تھا۔ یہ تعین بھی مشکل ہے کہ ان کی مغائرت تشکیک کا باعث بنتی ہے یا تشکیک مغائرت کا یا دونوں ہمہ وقت کار فرما ہیں۔ ان کی نظم ناکارہ اس کی ایک مثال ہے۔

کون آیا ہے
کوئی نہیں آیا ہے پاگل
تیز ہوا کے جھونکے سے دروازہ کھلا ہے

اور پھر اس نظم کا اختتام دیکھیے

آتا تو اچھا کون آتا

کس کو آنا تھا کون آتا

جون ایلیا خود اپنے آپ سے برگشتہ ہے۔ یہ برگشتگی احساسِ محرومی اور مغائرت کو جنم دیتی ہے۔ لاحاصلی کا دکھ احساس بیگانگی کو بڑھا دیتا ہے۔ جون ایلیا نے بیگانگی اور بے معنویت کے اس احساس کو تخلیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظم اجنبی شام اس کی ایک مثال ہے۔

دھند چھائی ہوئی ہے جھیلوں پر
اڑ رہے ہیں پرند ٹیلوں پر
سب کا رخ ہے نشیمنوں کی طرف
بستیوں کی طرف ، بنوں کی طرف
اپنے گلوں کو لے کے چرواہے
سرحدی بستیوں میں جا پہنچے
دلِ ناکام میں کہاں جاؤں؟
اجنبی شام میں کہاں جاؤں؟

جون ایلیا کے پہلے مجموعہ کلام شاید کی اس نظم اجنبی شام سے گویا کی نظم ناکارہ تک میں مابعد جدید دور کا یہ المیہ بکھرا ہوا ہے کہ آباد شہر میں کتھارسس کے لیے کوئی ایک بھی میسر نہیں ہے۔ یہ اجنبیت لایعنیت کا باعث بنتی ہے۔ رشتے ناطے بے معنی ٹھہرتے ہیں۔ زندگی میں کبھی آرام نہ ملنے کا احساس انہیں خود اذیتی پر مجبور کر دیتا ہے۔ خصوصاً زاہدہ حنا سے علاحدگی ان کے لیے بڑا عذاب ثابت ہوئی۔ وہ کئی سال ایک نیم تاریک کمرے میں تنہا بیٹھے رہے۔ شراب نوشی اور سگرٹ کشی کی کثرت نے ان کی صحت بگاڑ دی۔ وہ خون تھوکنے لگے۔ ان کے پھیپھڑے بری طرح متاثر ہوئے۔ لیکن شراب سے باز نہیں آئے۔ علاحدگی کے بعد کا کلام تنہائی، مغائرت اور بیگانگی کے شدید احساسات میں لپٹا ہوا ہے۔ وہ اپنے شدید کرب کو شاعری میں نہ صرف

جوں کا توں پیش کرتے ہیں بلکہ اس کی تزئین کرتے ہیں۔ یوں یہ خود اذیتی انہیں راس آجاتی ہے۔ دق رومان پرور اور بواسیر بڑے بھائی کو ہونے کے باعث پسندیدہ ٹھہرتی ہے۔

جونؔ ایلیا کو اپنے بڑے نہ ہو سکنے اور رائیگاں گزرنے کا روگ اور اعتراف تھا۔ ان کی مثالیہ پسندی عذاب بن گئی تھی۔ ایک برتر ذہنی سطح کا آدمی خود کو بونوں میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ نظریاتی پہرہ داروں کے سطحیت نے اسے وجودی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ کڑا جبر اسے چپ تو نہ کرا سکا لیکن مجموعی انسانی آواز کے دبنے کا دکھ اسے اندر ہی اندر چاٹ گیا۔

ایک ہی حادثہ تو ہے اور وہ یہ کہ آج تک
بات نہیں کہی گئی ، بات نہیں سنی گئی

ب) تحقیقی نتائج:

جون ایلیا پیچیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ پروفیسر سحر انصاری کے بقول وہ خط مستقیم کی آدمی نہیں تھے۔ مقالے کے باب دوم میں ان کی حیات کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ان کی منفیت پسندی کی کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔ اس کے محرکات ہمہ جہت تھے۔ والد کا عالمانہ استغراق، والدہ کی محرومیاں، والد سے ان کی کتابوں کی اشاعت کے وعدے کی عدم تکمیل، امروہہ کا پراسرار ماحول، اس دور کا سیاسی اور سماجی انتشار، تقسیم ہند، ہجرت، ناکام ازدواجی زندگی، اولاد سے علاحدگی اور خصوصاً ان کی مثالیہ پسندی شامل ہیں۔ لیکن بنیادی وجہ وہ خود تھے۔ احمد جاوید کے بقول ان کی شاعری کا مادۂ معنویت اور جوہرِ کیفیت خود وہ ہیں۔ جون ایلیا کے ذہنی و فکری پس منظر پر بحث سمیٹتے ہوئے سید محمد تقی کہتے ہیں کہ دیگر محرکات اپنی جگہ لیکن اگر جون ایلیا کے ذہن کو مرکز نہ مانا جائے تو تمام تعبیرات غلط ہو جائیں گی۔ جون ایلیا کی بھتیجی شاہانہ رئیس ایلیا اپنی کتاب چچا جون میں لکھتی ہیں کہ جون کے تایا نفیس حسن بے اولاد تھے۔ جب جون ایلیا کے بڑے بھائی رئیس امروہوی کا جنم ہوا تو وہ جون ایلیا کی والدہ کی مشاورت کے بغیر تایا کو دے دیے گئے۔ جس سے جون کی والدہ کی حالت مزید خراب ہو گئی۔ ان کی ماں کی محرومیاں؛ گھٹن، غصہ اور اداسیاں گھاؤ بن گئیں اور وہ سب مل ملا کر جون ایلیا

کی شکل میں پیدا ہو گئیں۔ مبین مرزا ان کے طرزِ زیست اور وضعِ سخن پر اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نمو پذیری کے کسی ابتدائی دورانیے ہی کے کسی مرحلے پر ذہنی تنہائی کے شدید احساس نے انہیں آ لیا۔ جس نے وقت گزرنے کے ساتھ انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

جون ایلیا علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں علمی مباحث جاری رہتے تھے۔ انہیں خود بھی فلسفے کا شوق تھا۔ چناچہ تعقل کے نتیجے میں وہ تشکیک اور لا ادریت سے ہوتے ہوئے الحاد اور انکار تک چلے گئے جس کی تفصیل مقالے کے باب سوم میں بیان کی گئی ہے۔ جون ایلیا کی نظم رمز ہمیشہ ان کے تعقل کا سفر نامہ ہے۔ شعری مجموعے شاید میں شامل اس نظم میں انہوں نے اس سفر کا دلکش احوال بیان کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح وہ یقین کامل سے سرشار تھے جو تشکیک کے نتیجے میں ایک ہمہ جہت اضطراب میں بدل گیا۔ اور پھر لا ادریت سے ہوتا ہوا الحاد اور انکار تک چلا گیا۔ حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ ان کی کیفیت بھی بدل جاتی ہے۔ اور ہمیں ایمان سے انکار تک ہر رنگ ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ لیکن ان سب رنگوں میں غالب رنگ گمان یا تشکیک کا ہے۔ وہ اپنی ذات اور انسانی تعلقات سے لے کر وجودِ خدا تک پر تشکیک کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ہر کسی سے برگشتہ ہیں۔ یہ برگشتگی بیگانگی کو جنم دیتی ہے۔ لاحاصلی کا احساس ان کا دکھ بڑھا دیتا ہے۔ جس کا اظہار ان کے ہاں مایوسی، تنہائی اور بیگانگی کی شکل میں ہوا ہے۔ جون ایلیا رشتوں ناتوں کے بھی زیادہ قائل نہیں تھے۔ جب فطرت کے ہاں جدائی ناگزیر ہے تو پھر رشتوں کو بنائے رکھنے کی جدوجہد کیا معنی رکھتی ہے؟ مغائرت کی بہت سی صورتیں جون ایلیا کی شاعری میں موجود ہیں۔ جن میں لایعنیت، خود انہدامی اور خود تضحیکی نمایاں ہیں۔ مقالہ کے باب سوم اور چہارم میں درج شعری مثالیں بتاتی ہیں کہ جون ایلیا کو کرب راس آ گیا تھا۔ وہ اس کرب سے نجات کی بجائے اس میں رہنا اور اس میں شدت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے وہ خون تک تھوکتے تھے۔ چناچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ

1۔ جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک اور مغائرت کے ہر نوع کے عناصر موجود ہیں۔ ان عناصر کے محرکات یوں تو کئی ایک ہیں لیکن خلقی عنصر نمایاں ہے۔

2۔ جون ایلیا کی شاعری میں تشکیک اور مغائرت کے عناصر کی کار فرمائی بے ساختہ، وارفتہ اور شدید ہے۔

ج) سفارشات:

1۔ جون ایلیا کے فکری تنوع، تضادات، جمالیاتی ذوق اور تصورِ عشق پر علاحدہ علاحدہ کام کی گنجائش ہے۔

2۔ جون ایلیا غزل کے شاعر کے طور پر زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی فکر کے تفہیم میں غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظمیں زیادہ معاون ہیں۔ اس لیے ان کی نظموں پر علاحدہ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

3۔ جون ایلیا کے آخری تین شعری مجموعوں کا انتخاب شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

4۔ جون ایلیا کے شاعری کے لیے 'ریڈر رسپانس تھیوری' ایک بہتر تناظر ہو سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

جون ایلیا، شاید، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 1998ء

جون ایلیا، یعنی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2007ء

جون ایلیا، گمان، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2006ء

جون ایلیا، لیکن، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2014ء

جون ایلیا، گویا، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2011ء

ثانوی مآخذ

ابو الاعجاز حفیظ، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، 1985ء

احمد فراز، اے عشق جنوں پیشہ، لاہور، دوست پبلی کیشنز، 2010ء

افتخار بیگ، ڈاکٹر، وجودیت اثباتِ ذات کا فلسفہ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، 2013ء

الطاف حسین حالی، مسدس حالی، حالی پبلشنگ، دہلی، 1935ء

انور احسن صدیقی، دل پر خوں کی اک گلابی سے، شہر زاد، کراچی، 2012ء

اے سی ایونگ، فلسفہ کے بنیادی مسائل، مترجم میر ولی الدین، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی، 1978ء

بشیر بدر، آزادی کے بعد کی اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، 1981ء

جون ایلیا، فرنود، تالیف و تترتیب خالد احمد انصاری، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2012ء

خالد احمد انصاری، میں یا میں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2020ء

ڈاکٹر ظفر مراد آبادی، بہ عنوان: جون ایلیا: ایک تجزیاتی تاثر، مشولہ: ایوانِ اردو، اردو اکادمی، دہلی، 2003ء

سارتر، جین پال، ایگزسٹنشلزم از ہیومنزم، ورلڈ پبلشنگ کمپنی، یو ایس اے، 1956ء

سلام سندھیلوی، ڈاکٹر، اردو شاعری میں لاادریت، ادبی مرکز، گورکھپور، 1988ء

سلیم شہزاد، فرہنگ ادبیات، منظر نما، مالیگاؤں، بھارت، 1998ء

سی اے قادر، کشاف اصطلاحاتِ فلسفہ، بزمِ اقبال لاہور، س ن
سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، الفیصل ناشران، لاہور، جلد چہارم، 2017ء
سید قمر رضی، قلم گوید، رائٹرز بک فاؤنڈیشن کراچی، 2010ء
شاد عظیم آبادی، میخانہ الہام، برقی مشین، پٹنہ
شاہانہ رئیس امروہی، چچاجون، فضلی سنز، اردو بازار، کراچی، 1916ء
شمس الرحمن فاروقی، اندازِ گفتگو کیا ہے، مکتبہ جامع، نئی دلی
شیما مجید / نعیم احسن، فلسفہ اور وجودیت، بک پرنٹر لاہور، 1992ء
صفدر میر، مارکس کا تصور بیگانگی، دانیال، کراچی، 1987ء
ظفر سپل، ورثۂ دانشِ یونان، بک ہوم، کراچی، 2013ء
عبدالقادر غیاث الدین فاروقی، ڈاکٹر، اردو شاعری اور تصوف، جامع نظامیہ، حیدر آباد، بھارت، 2009ء
عتیق اللہ، ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، اردو منزل دہلی، 1995ء
عرفان جاوید، سرخاب، بک کارنر جہلم، 2018ء
علامہ محمد اقبال، پیام مشرق، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، طبع دہم، 1963ء
عمر خیام، مجموعہ رباعیات عمر خیام، منشی نول کشور، لکھنؤ، 1969ء
فرہنگِ آصفیہ، سید احمد دہلوی، الفیصل ناشران، اردو بازار لاہور، 2017ء
فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1999ء
قاضی جاوید، فلسفہ وجودیت اور انسان دوستی، مشعل، لاہور، 2005ء
کارل مارکس، داس کیپٹل، مترجمہ سید محمد تقی، دارلشعور، لاہور، 2004ء
محمد صفدر میر، مارکس کا نظریۂ بیگانگی، مکتبہ دانیال، کراچی، 1987ء
مرزا غالب، دیوانِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، شیخ غلام علی، لاہور، 1967ء
میر تقی میر، دیوان اول، مشمولہ: مزامیر یعنی انتخاب کلام میر، اثر لکھنوی، کتابی دنیا، دہلی، 1947ء
میر دردؔ، خواجہ، دیوان درد، مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، مکتبہ جامع، نئی دہلی، 1963ء
ن م راشد، کلیات راشد، کتابی دنیا، دہلی، 2011ء
نسیم سید، خوش گزراں گزر گئے، اکادمی بازیافت، کراچی، 2011ء

نظیر صدیقی: جدید اردو غزل ایک مطالعہ، گلوب پبلشرز لاہور، 1984ء
نقوش نقوی، تذکرہ شعراء امروہہ، سخن ور، کراچی، 2008ء
وحید اختر، ڈاکٹر، فلسفہ اور ادبی تنقید، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، 1972ء
جون ایلیا، سسپنس ڈائجسٹ، کراچی، اکتوبر 2012ء
تحقیق نامہ، شعبہ ء اردو جی سی یونیورسٹی، لاہور
ایونِ اردو، اردو اکیڈمی، دہلی
سنڈے میگزین، روزنامہ جنگ، لاہور
ہلال، راولپنڈی، ستمبر 2015ء

Cuddon, J. A., A Dictionary of Literary Terms and Literary Theory, Penguin, GB, 1992

Fallen S.W English Urdu Dictonery, Urdu Science Board, Lahore, 1982

Judy Pearsall, Concise Oxford Dictionary, 12, OUP, London, 10th Edition, 1999

Meszaros, Marx's Theory of Alienation, HarperCollins, NY, 2000